ابتدا تیرے نام سے

قارئینِ کرام! نئے سال کا آغاز کچھ یوں ہوا ہے کہ دل غم کی شدت سے پھٹے پڑے ہیں۔ سانسیں آہیں بن گئی ہیں اور آنکھیں سوالی۔ ایک سو تینتیس کم سن بچوں سمیت ایک سو بیالیس معصوم جانیں اس دہشت گردی کی نذر ہوگئیں جس کے خلاف جنگ کا ہم گزشتہ چودہ برس سے علم اٹھائے ہوئے ہیں۔ ایک سو بیالیس گھرانے اجڑ کے رہ گئے، ایک سو تینتیس ماؤں کی گودیں ویران ہوگئیں۔ پورا ملک گویا سناٹے میں آ گیا۔ ہنستے کھیلتے بچے سکول گئے اور خون آلود لاشوں میں ڈھل کر گھروں کو لوٹے۔ ان کے ماں باپ کو کیسے صبر و قرار آئے جب کہ یہ سانحہ تو سننے اور دیکھنے والوں کے لیے بھی قیامت سے کم نہیں۔ آہ! اس دہشت گردی کی جنگ نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ دہشت گردی کم تو کیا ہوتی، ملک کا ہر شہری اب خود کو کہیں زیادہ غیر محفوظ محسوس کر رہا ہے۔ ۱۶ دسمبر جو پہلے ہی ہماری تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا، اب اس کی سیاہی ایک بار پھر نئے معنوں کے ساتھ ہم پر مسلط ہوگئی ہے، غم کی کیفیت نئے سرے سے اداسی بن کر ہر دل میں اتر آئی ہے اور ہر آنگن میں بس گئی ہے۔

ان بچوں کا خون ان حکمرانوں کے ہاتھوں پر ہے جنہوں نے عالمی شاطروں کے شیطانی مفادات پر مبنی اس جنگ میں ہمارے عوام کو دھکیلا اور ان پر بھی جنہوں نے ان پالیسیوں کو عوامی مخالفت کے باوجود برقرار رکھا۔ جنہوں نے دس سال قبل باجوڑ میں قرآن پڑھتے ہوئے ہمارے ہی ۸۳ پاکستانی معصوم بچوں کی امریکی بمباری سے شہادت کو یوں لیا جیسے وہ کوئی جیتے جاگتے ہمارے بچوں جیسے بچے نہ تھے بلکہ کوئی پلاسٹک کی گڑیائیں تھیں۔ جیسے ان کی مائیں نہ تھیں جنہوں نے ان کو تیار کر کے پڑھنے بھیجا ہو۔ جیسے وہ بچے ریاست کی ذمہ داری نہ تھے کہ ان کی شہادت پر بش سے انتقام لینے کا عزم کیا جاتا، ٹی وی پر نوحے پڑھے جاتے، بہن بھائیوں کی چیخیں سنوائی جاتیں۔ ان بچوں کا خون ان حکمرانوں کے ہاتھوں پر ہے جنہوں نے لال مسجد کو بے گناہوں کے خون سے لال کیا اور دینی حمیت سے لبریز باحیا بچیوں کو ان کی مادرِ علمی میں ہی فاسفورس بموں سے جلا ڈالا اور پھر ان کی کٹی پھٹی لاشیں بھی ورثا کے حوالے نہ کیں کہ ان کے ماں باپ اپنے بچے یا بچی کو جسے نہ جانے انہوں نے کتنے مہینے سے نہ دیکھا تھا، آخری بار ہی دیکھ سکیں۔ جنہوں نے اپنے آقاؤں بش اور اوبامہ کے کہنے پر اپنے ہی ہموطنوں پر ڈرون حملوں میں بے شمار پھولوں جیسے بچے مسل ڈالے اور ان ڈرونز کا سات سمندر پار سے بٹن دبانے والے شیطان صفت انسان اس سے ویڈیو گیم کا سا مزا لیتے رہے اور آج بھی لے رہے ہیں۔

اس سانحے کے بعد ایک بار پھر شدت سے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بارے میں ہماری پالیسیاں زیرِ بحث آ رہی ہیں۔ ایک بات بار بار دہرائی جا رہی ہے اور ایسی ہر بزدلانہ واردات کے بعد شدومد سے کہی جاتی ہے کہ دہشت گردوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، ایسا کرنے والے مسلمان تو کیا انسان بھی نہیں ہیں، یہ کونسی جنت چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بات بالکل درست ہے۔ مگر ساتھ ہی ایسے قبیح کام کرنے والوں کے بہانے سے ملک میں موجود دینی عناصر کو شک کا نشانہ بنانا، ان کو ہر حیلے بہانے سے دہشت گردوں کا حامی ظاہر کرنا، ان پر الزام تراشی کرنا، مدرسوں اور مساجد کو ٹارگٹ بنا کر انتقامی کارروائیوں کی دھمکیاں دینا، یہ سب اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ دراصل ایسے واقعات کروانے والوں کے مقاصد کچھ اور ہیں۔ کبھی اقلیتوں کے ساتھ کسی معاملے کو خاص رنگ دے کر مذہبی منافرت پیدا کرنے کی کوشش، کبھی کسی واقعے کو فرقہ واریت کا رنگ دے کر بگاڑنے کا کام، یہ تماشا ہم گزشتہ کئی سالوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اصل مجرموں کے خلاف نہ تو قانونی کاروائی ہوتی ہے اور نہ ہی عوام کو حقائق سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

ہم سب نے بلیک واٹر کے دہشت گردوں کا پاکستان میں کھلا عمل دخل دیکھا۔ ریمنڈ ڈیوس جیسے کرائے کے قاتلوں کی عزت افزائی دیکھی۔ غیر ملکیوں کی کھلی آمد و رفت دیکھی۔ امریکی ایمبیسی کی توسیع اور قلعہ بندی دیکھ رہے ہیں۔ درجنوں سانحوں میں غیر ملکی ایجنسیوں کے شواہد ملے

ہیں۔گزشتہ سال مذاکرات کا وقت وہ واحد وقت تھا جب پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات ہونا بند ہو گئے تھے۔مگر پھر عین مذاکرات کے دوران ڈرون حملہ کر دیا گیا۔کیا ہمیں اپنے ملک میں امن قائم کرنے یا امن کے لیے جنگ کرنے کے فیصلے خود کرنے کا حق نہیں ہے؟ کیا یہ طے کرلیا گیا ہے کہ غیروں کے مفادات کی یہ منحوس جنگ ہی ہماری قسمت ہے اور ہمیں کہیں اور طے شدہ راستوں پر ہی چلنا ہوگا؟

اس بار کا دکھ بہت بڑا ہے۔اور بڑے دکھ بڑے فیصلوں تک پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔اگر اب بھی ہم نے ہوش مندی اور خودداری کے فیصلے نہ کیے تو آنے والا ہر دن ہمیں مزید غیر محفوظ بناتا چلا جائے گا۔اس سانحے کو عالمی تناظر میں دیکھے بغیر ہم درست فیصلہ کر ہی نہیں سکتے۔ہماری آنکھوں کے سامنے عراق کا سکون چھین لیا گیا،غزہ کی محصور آبادی پر ایسے ظلم توڑے جا رہے ہیں کہ انسانیت منہ چھپاتی ہے مگر ضمیرِ عالم سو رہا ہے۔مصر میں نہتے جمہوریت پسندوں کے ساتھ وہ سلوک ہؤا جو مسلح دشمن کے ساتھ ہوتا ہے صرف اس لیے کہ وہ عالمی مفادات کے لیے خطرہ بننے جا رہے تھے۔ہمیں اس جنگ کا دائرہ گلی محلوں میں پھیلانے ،اپنے لوگوں میں مزید دشمن پیدا کرنے اور عوام کو مزید غیر محفوظ بنانے کی بجائے اپنی سمتِ سفر درست کرنی چاہیئے۔دین داری کو الزام بنانے کی طرف جو راستا جاتا ہے وہ ملک وقوم کو مزید تباہی کی طرف لے جائے گا کیونکہ ہزار خرابیوں کے باوجود آج بھی دین سے محبت پاکستانیوں کے اندر خون کی طرح رواں ہے اور یہ دین ہی کا رشتہ ہے جس نے مختلف قومیتوں کو اس خطہِ ارضی میں ایک وحدت کی لڑی میں پرو رکھا ہے۔اس کو الزام بنائیں گے تو خاکم بدہن خانہ جنگی کے سوا کسی منزل پر نہیں پہنچیں گے۔اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے آمین۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مارے جانے والے دہشت گردوں کے بارے میں قوم کو حقائق سے آگاہ کیا جائے۔ہمیں پتہ چلنا چاہیئے کہ ہمارے بچوں کے قاتل کون ہیں،ان کی پشت پناہی کون کر رہا ہے اور ان کو اسلحہ اور فنڈز کہاں سے دیے جا رہے ہیں۔جب تک ان حقائق کو چھپایا جائے گا عوام کے اندر انتشار،بداعتمادی اور کنفیوژن کو اور فروغ ملے گا۔

جانے والوں کی یاد میں مسلمانوں کو دعائے مغفرت کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔موم بتیاں جلانا مشرکانہ رسومات میں سے ہے جسے بعد ازاں عیسائیت میں بھی رائج کرلیا گیا۔ہمارے ہاں یہ طریقہ گزشتہ چند سالوں میں بہت تیزی سے رائج ہؤا ہے۔ہمارے لیے مسنون طریقوں کی پیروی ہی مناسب راہِ عمل ہے۔

تھر میں قحط کی صورتحال برقرار ہے۔ایک ماہ کے دوران سو بچوں کی ہلاکت کسی طرح قومی المیے سے کم نہیں۔کئی غیر سرکاری ویلفیئر تنظیمیں تھر میں غذا اور علاج کی فراہمی کے لیے سرگرم عمل ہیں لیکن اصل ذمہ داری حکومت کی ہے جس کے پاس بیشمار وسائل ہیں۔ملک کے ایک حصے میں انسانی بچے غذائی قلت سے مر رہے ہوں اور باقی ملک کے لوگ انواع واقسام کی نعمتوں سے بدستور نہ صرف لطف اندوز ہوں بلکہ ضائع بھی کریں اور خصوصاً اربابِ اختیار کی عیاشیوں میں کوئی فرق نہ آئے یہ رویہ قابلِ افسوس ہے۔حکومت کی ساری مشینری کو اس غذائی قلت کو دور کرنے کے لیے حرکت میں آجانا چاہیئے تھا۔مگر کئی ماہ گزر جانے کے باوجود تھر میں بچوں کی اموات میں کمی نہیں آسکی۔اس صورتحال میں ہمیں بطور شہری اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سانحہِ پشاور میں جانے والوں کے لواحقین کے لیے اللہ سے خصوصی صبر ورضا عطا کرنے کی دعائیں ہیں۔پرنسپل طاہرہ قاضی اور باہمت اساتذہ نے ہمارا سر فخر سے بلند کیا ہے۔اللہ ان کو بلند درجے عطا کرے۔آمین۔

قارئین کرام یہ ربیع الاوّل کا بابرکت مہینہ ہے جس میں رب العالمین نے ساری انسانیت پر عظیم احسان کرتے ہوئے جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کو رحمتہ اللعالمین بنا کر اس دنیا میں بھیجا۔یہ ہم مسلمانوں کی خوش نصیبی ہے کہ اللہ نے ہمیں حضور ﷺ کی غلامی کا شرف بخشا لیکن اس نعمتِ عظمیٰ کا حق اور شکر صرف اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ ہم آپ ﷺ کی محبت اور اطاعت کو اپنی زندگی کا اوّلین مقصد بنالیں۔آپ ﷺ کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے اور آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ تمام انسانوں کیلئے نمونہ ہے۔

دعا گو۔صائمہ اسما

نصرت محمود قریشی

میرے بے لوث باغبان ﷺ

اللہ تعالیٰ سورۂ فتح میں فرماتا ہے، اُن یعنی (اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آنے والوں کی اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مثال ایسی ہے جیسے بویا ہوا ایک بیج جو (ابتداءً) اپنی باریک سی کونپل زمین سے نکالے اور پھر اسے توانائی و طاقت دے تا کہ وہ مضبوطی سے اُگے۔ پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہو جائے تا کہ جس نے اس بیج کو بویا تھا وہ دیکھ کر خوش ہو۔ اور جو اس کے کام (مشن) کو مٹانا چاہتے تھے ان کا جی جلائے وہ غصے میں آئیں (کہ ہماری ساری کوششیں رائیگاں گئیں) اور اللہ کی مدد سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کاوشیں پھل لائیں) (48:29) یہ سورہ فتح کی آخری آیت ہے۔

کیا آپ نے کبھی اپنے مالی کو پودوں کے لئے زمین تیار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ سب سے پہلے پھاوڑے سے زمین کو کھودتا ہے ضرب لگاتا ہے۔ پھر اس میں سے کنکر پتھر وغیرہ نکالتا ہے۔ پھر پانی دے کر زمین کو نرم کرتا ہے۔ پھر کچھ ناپسندیدہ پودے سر نکالتے ہیں، انہیں چن چن کر نکالتا ہے۔ موسمی پھولوں کے لئے اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی لیکن بڑے اور پھلدار درختوں کے لئے جن کی جڑیں زمین میں اپنے رزق کے لئے دور دور تک پھیلتی ہیں، ان کے لئے زمین کی تیاری کا خاص اہتمام کرتا ہے جو جذبہ اسے یہ سب کام کرنے پر ابھارتا ہے، وہ اپنے کام سے لگن اور اپنے مقصد کو پانے کی تڑپ ہے جو اسے دوپہر کی کڑی دھوپ میں بھی کام کرنے پر ابھارتی ہے۔ آپ کے اس مالی کی تڑپ دلسوزی اور مشقت اس جذبے کا عشیر عشیر بھی نہیں جو نبی کریمؐ میں موجود تھا۔ کیونکہ جس زمین میں انہیں توحید کا پودا لگانا تھا۔ اس زمین میں کفر و شرک کے مضبوط درخت بھی تھے، جہالت و انکار کی جڑی بوٹیاں بھی تھیں اور نفرت و عداوت کے کنکر پتھر بھی تھے۔ انہیں کلمہ طیبہ کا ایسا درخت لگانا تھا جس کی جڑیں زمین میں ثابت و مضبوط ہوں، شاخیں آسمان تک پھیلی ہوں اور وہ رہتی دنیا تک پھل لاتا رہے۔ (14:24)

اب ایسا درخت لگانے کے لئے جس لگن، تڑپ، مشقت اور دلسوزی کی ضرورت تھی وہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ میں بدرجہ اتم ودیعت کر دی تھی۔

اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میرے خیال میں مکی زندگی کے تیرہ سال جس مشقت اور جانفشانی میں گزرے وہ گویا ایک بنجر اور شور زدہ نہایت ناقص زمین کو قابل کاشت بنانے میں صرف ہوئے۔ اس عرصے میں کون سا ظلم ہے جو مشرکین مکہ نے روا نہ رکھا ہو۔ ذرا چشم تصور سے ایک بندۂ خدا کو دیکھیں جو صحن حرم میں بیٹھا اپنے حقیقی رب کو یاد کر رہا ہے۔ ایک دوسرا شخص آتا ہے جو اسے طرح طرح کے القابات سے نوازتا ہے، اسے لعن طعن کرتا ہے، برا بھلا کہتا ہے، اس پر ہر قسم کے غلیظ حملے کرتا ہے۔ نہ صرف اسے بلکہ اس کے خاندان کو بھی رگیدتا ہے اور وہ بندۂ خدا ہر بات کو خاموشی سے برداشت کرتا ہے۔ نہ جواب میں کوئی عذر پیش کرتا ہے، نہ جوابی کارروائی کے طور پر اسے برا بھلا کہتا ہے اور نہ ہی ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے کوئی مدد طلب کرتا ہے۔ جو صرف سب کچھ دیکھ تو سکتے ہیں لیکن مزاحمت نہیں کر سکتے کیونکہ بدسلوکی کرنے والا وقت کا فرعون ابوجہل ہے اور گالیاں کھانے والا ایک یتیم جوان..... جسے پہلے تو انہی لوگوں نے صادق اور امین کے خطابات دے رکھے تھے۔ لیکن اب اس لئے دشمن بن گئے ہیں کیونکہ وہ انہیں ان کے آباؤ اجداد کے غلط راستوں پر بھٹکنے کی بجائے ایک سیدھا راستہ دکھانا چاہتا ہے جو اسے ''علی وجہ بصیرۃ'' اپنایا ہے۔ اور جو نہایت دلسوزی کے ساتھ یہ چاہتا ہے کہ اس کی قوم اس کی باتوں پر عمل کر کے اصل کامیابی حاصل کرے۔ یہ تو ایک مثال ہے مکی زندگی تو اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ میرے ماں باپ اور میں آپؐ پر فدا ہوں، میرے اس دلسوز باغبان (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کردار کشی کی باقاعدہ مہم شروع کی گئی۔ کوئی انہیں ''مجنون، کاہن

اور شاعر'' (52:29) کہتا کوئی انہیں ''نساحِرٌ'' مبین'' پکا پکا جادوگر (10:2) کہتا۔کوئی اپنے زعم باطل میں ''مسحور'' (17:47) جادوزدہ سمجھتا۔ کوئی کہتا اسے کوئی آ کر پڑھا جاتا ہے (مُعلَّمٌ 44:14) اور یہ ہم پر رعب ڈالتا ہے۔کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔ابولہب نے تو باقاعدہ مشن کی طرح یہ کام پکڑا ہوا تھا کہ جہاں جہاں نبی کریمؐ جاتے یہ ان کے پیچھے پیچھے یہ کہتا ہوا چلتا،''لوگو! اس کی بات نہ سننا یہ جھوٹا ہے۔ میں اس کا چچا ہوں (مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ یہ جھوٹا ہے)''۔جن لوگوں نے ''صادق' اور 'امین' کا خطاب دے رکھا تھا وہ بھی ایسا کہنے سے کچھ تو بل جاتے ہوں گے دوسرا حربہ یہ استعمال کیا کہ رؤساء قریش مل کر بیٹھے اور انہوں نے سوچا کہ آخر اِس (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مسئلہ کیا ہے؟ کیا اس کے دماغ میں عرب کی بادشاہت کا سودا سما گیا ہے؟ شاید اس کو زیادہ شادیاں کرنے کی خواہش ہو یہ سوچ کر انہوں نے ایک وفد کی صورت میں ابوطالب سے ملاقات کی اور انہیں کہا کہ یا تو اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دو یا اسکو سمجھاؤ کہ اپنے مشن سے باز آ جائے۔ پھر دوسرا وفد آیا جس نے کہا کہ اگر محمد (ﷺ) کو بادشاہ بننے کا شوق ہے تو ہم انہیں پورے عرب کا بادشاہ بنا دیتے ہیں۔اگر دولت کی ہوس ہے تو ہم بے شمار دولت اسے دے دیتے ہیں۔شادی کے لئے عرب کی خوبصورت ترین عورتیں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو جملہ ان سب باتوں کے جواب میں کہا وہ سب کو معلوم ہی ہے کہ ''اگر یہ میرے ایک ہاتھ پر چاند (دنیا کی متاع، خوبصورت ترین عورتیں) اور دوسرے پر سورج (طاقت کا سرچشمہ) بھی رکھ دیں تو اپنے مشن سے باز نہیں آؤں گا۔''

میرے باغبان کو حق کا پودا لگانے سے باز رکھنے کیلئے ان کے خاندان بنو ہاشم کا سوشل بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔سوشل بائیکاٹ کا مطلب یہ کہ ان سے کوئی لین دین کرے، نہ ان کے ہاتھ کوئی چیز بیچے نہ ان سے رشتہ داری قائم کرے یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچے روئیں تو انہیں دودھ کی ترسیل بھی بند کر دی جائے۔ اور یہ بائیکاٹ ایک دو مہینے کے لئے نہیں پورے تین سال تک جاری رہا۔ خدیجہؓ جو بہرحال اس زمانے کی ایک Buisness Tyeoon تھیں۔ اور ظاہر ہے ان کا رہن سہن ویسا ہی ہوگا۔اس سوشل بائیکاٹ کی سختیاں سہتے سہتے اس قدر کمزور ہوگئیں کہ اس کے کچھ دیر بعد ہی اس دارفانی سے کوچ کر گئیں۔ یہی حال ضعیف ابو طالب کا ہوا۔کفار کا خیال تھا کہ ایک ہی سال میں دو محسنوں کی وفات سے نبی کریمؐ کا مورال گر جائے گا لیکن نبی کریمؐ نے نہایت غمگین ہونے کے باوجود اپنے مشن کو ترک نہیں کیا۔صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

جب یہ حربہ بھی ناکام ہوا تو کفار قریش نے یہ ترکیب نکالی کہ پھر اس جوان (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قصہ ہی تمام کر دینا چاہیے۔آپ کو پتہ ہی ہے کہ نبی کریمؐ سے پہلے بھی اور بعد میں بھی فرعونوں کا یہی وطیرہ رہا ہے کہ جو ان کے مفادات کے خلاف ہو یا صرف ان سے اختلاف رکھتا ہو اسے ختم کر دو۔سو انہوں نے باقاعدہ پلان بنایا کہ ہر قبیلے میں سے لوگ اکٹھے ہو کر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کا محاصرہ کر لیں اور جونہی وہ باہر نکلیں انہیں قتل کر دیا جائے اب اس غریب، بے نوا، یتیم اور لاولد (نعوذ باللہ) میرے منہ میں خاک کا کوئی والی وارث تو ہے نہیں جو ہم سے بدلہ لے سکے۔اس طرح اس سے ہماری جان چھوٹ جائے گی۔لیکن وہ یہ بھول رہے تھے کہ اُس (محمدؐ) کا والی وارث تو وہ ہے جو سب سے زیادہ قوی، متین اور ساتھ ساتھ علیٰ کُلِّ شیٍٔ قَدِیر بھی ہے۔وہ ان کو اس ہجوم سے ایسے نکال کر لے گیا کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ میں جب بھی اس واقعے کو یاد کرتی ہوں تو مجھے وہ آیت یاد آ جاتی ہے۔

''وَاِذَاقَرَأتَ القرآن جَعَلْنَا بَیْنَکَ وَبَیْنَ الذین لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالآخِرَةِ حجابًا مَّسْتُوْرًا'' (17:45)

جب تم (اے محمدؐ) قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ایک چھپانے والا پردہ حائل کر دیتے ہیں۔''

بالآخر مکہ جو نبی کریمؐ کی جائے پیدائش تھی، اسے چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔اپنی جائے پیدائش کو چھوڑنا کوئی آسان بات نہیں ہوتی لیکن مقصد کو پانے کی لگن ہر چیز کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔سو میرے بہادر باغبان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے نکل

کر غارِ ثور میں جا چھپے تا کہ کفار اپنے مکروہ عزائم میں ناکام ہوں۔ اور وہ کلمہ طیبہ کا ایسا درخت لگا سکیں جو پورے عرب بلکہ پوری دنیا کیلئے ایسا سایہ فراہم کر سکے جو امن ہی امن ہو۔

قارئین کرام آپ میں سے اکثر حج کی سعادت حاصل کر چکے ہونگے۔ اگر آپ کو غارِ ثور دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ دیکھیں کہ اس غار تک پہنچنا کسی ماہر کوہ پیما ہی کا کام ہے۔ لیکن میں اور میرے ماں باپ صدقے جائیں ان قدموں کے جو ضرورت کے وقت کوہ پیما کے قدم بن گئے۔ انہوں نے کسی کی چوری تو نہیں کی تھی، ڈاکہ تو نہیں ڈالا تھا، کسی کی امانت میں خیانت نہیں کی تھی کسی کو قتل تو نہیں کیا تھا، پھر انہیں مشرکینِ مکہ نے کیوں انؐ کے گھر سے نکالا جہاں انؐ کے محسنوں کی (خدیجہؓ اور ابو طالب) اور انؐ کے آباؤ اجداد کی "قبریں تھیں" جہاں وہ پیدا ہوئے تھے جن گلیوں میں وہ پل کر جوان ہوئے تھے۔ یہ سارے ایک اور پہلو جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتی ہوں وہ یہ کہ مکہ کی سوسائٹی کا ناقابلِ برداشت پریشر تو تھا ہی۔ ایک پریشر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی تھا۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ ضحیٰ میں "اَنْقَضَ ظَهْرَكَ" جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی" کے الفاظ میں کیا ہے۔ اور فرمایا، "لَوْ اَنْزَلْنَا. اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ وہ "خشیۃ اللہ" خوف خدا سے دبا اور پھٹا جاتا ہے۔" (59:21) پہاڑ پھٹ جاتا تو وہ تو گوشت پوست کے انسان تھے۔ تبھی بقول عائشہؓ بوقت وحی کے سخت سردی میں بھی جبینِ اطہر سے پسینہ موتیوں کی طرح گرتا تھا" وحی کا پریشر تو سب انبیاء نے برداشت کیا۔ لیکن یہ پریشر، "وہ (کفار) کہتے ہیں کہ ہم ہرگز تمہاری بات نہیں مانیں گے جب تک کہ تم زمین سے ہمارے لئے ایک چشمہ نہ بہالاؤ، یا پھر (کم از کم) تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے تم ہمیں نہریں بہا کر دکھا دو۔ یا پھر (جو عذاب کے ڈراوے بیان کرتے رہتے ہو) آسمان سے ہمارے اوپر کوئی ٹکڑا ہی لا گراؤ یا اللہ تعالیٰ اور (کم از کم) کوئی فرشتے ہی تمہارے ساتھ ہوں (جیسے وزیرِ اعظم کے آگے پیچھے ہٹو بچو! کہنے والے ہوتے ہیں) یا تمہارا کوئی سونے کا گھر ہو یا پھر تم آسمان پر جا چڑھو اور ہم پھر بھی نہیں مانیں گے حتیٰ کہ (تم آسمان سے ہاتھ میں کوئی) کتاب لے کر اتر آؤ جسے ہم پڑھ بھی سکیں۔" (17:90-93)

کفار نے تو پیغمبروں کے متعلق سنا ہوا تھا کہ وہ عصا ڈالتے تو سانپ بن جاتا (موسیٰؑ) (اللہ کے حکم) کوڑھی اور برص والے کو اور اندھے کو ٹھیک کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ مُردوں کو بھی زندہ کر دیتے تھے۔

(عیسیٰؑ) ہوائیں ان کے تابع تھیں، جن ان کے لئے کام کرتے تھے۔ (سلیمانؑ) تو کفار بہت پریشر ڈالتے تھے کہ چلو مندرجہ بالا سب باتوں میں سے کوئی ایک تو کر دو! لیکن اللہ تعالیٰ نبی کریمؐ سے فرماتا ہے۔

"قُلْ هَلْ كُنْتُ بَشَرًا رَسُوْلاً (17:93)" کہہ دو (ان سب باتوں میں سے تو میں کچھ نہیں کر سکتا) میں تو صرف ایک بندہ بشر ہوں جو بطور رسول تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں۔"

پھر فرمایا، "ہمیں معلوم ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس سے تمہارا دل تنگ ہوتا ہے۔ (تنگدل ہونے سے کچھ نہیں ہوگا) صرف اپنے رب کی تسبیح کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔" (15:97)

پھر فرمایا، "اگر تمہیں ان کے اعتراضات اور ایمان لانے سے اعراض کرنا زیادہ ہی گراں گزر رہا ہے تو (جاؤ) زمین میں کوئی سرنگ کھود کر (اس میں جا چھپو) یا اگر استطاعت رکھتے ہو تو آسمان میں کوئی سیڑھی لگا کر (ان کی فرمائشوں کے مطابق کوئی نشانی ان کو لا دکھاؤ۔ (سنو) اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔

اور وہ کوئی نشانی دیکھے بغیر ہی غیب پر اور تمہاری باتوں پر ایمان لے آئے۔

(کیا وہ علیٰ کُلِّ شیءٍ قَدِیر یہ نہیں کر سکتا؟ کر سکتا ہے) تو تم ہرگز (جاہلوں والی باتیں نہ کرو) جاہل نہ بنو۔" (6:3)

کفار کا نشانی (معجزہ) دکھانے پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کا انکار، یہ چکی کے دو پاٹ تھے جن کے درمیان نبی کریمؐ کی ذات تھی۔ مگر سلام ہو اُس بہادر اور متقی انسانؐ پر جنہوں نے یہ سب کچھ سہا اور ہر صورت میں اپنے مشن کو پورا کیا۔ اپنی ذات کے لئے نہیں اپنی اُمت کے لئے!!

فرماتے تھے، ''ہر نبی کے لئے ایک ایسی دعا ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے مانگے گا تو وہ ضرور قبول کی جائے گی (اسکی زندگی میں ہی) لیکن میں نے اپنی دعا کو قیامت والے دن کے لئے اپنی امت کی شفاعت کے واسطے بچا کر رکھا ہوا ہے۔'' (بخاری حدیث 6305) کتاب الدعوات)

سو معزز قارئین! جو بیج میرے بہادر بے لوث اور خوفِ خدا رکھنے والے باغبان نے لگایا تھا، اس کے لئے جس قدر مشقت اور جانفشانی سے اس کی آبیاری کی کہ آج پندرہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی بہر حال وہ درخت پھل لا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے، ''جس طرح ہم نے تمہیں میں سے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا جو ہماری آیتیں تمہیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے۔ تمہارا تزکیہ کرتا ہے۔ یعنی تمہارے دل و دماغ میں جو الٹے پلٹے ازم کے مضبوط درخت راسخ ہو چکے ہیں، کفر و شرکت کی جڑی بوٹیاں ہیں نفرت و عداوت کے کنکر پتھر میں سب کو چن چن کر نکالتا ہے اور زمین قلب کو پاک صاف کر کے حق کا پودا قبول کرنے کے قابل بناتا ہے۔'' (2:151)

ہمارے باغبان نے تو بہت محنت کی، ماریں کھائیں (طائف) ابوجہل نے خون نکال دیا، (جس واقعے کے بعد حمزہؓ ایمان لائے) گلے میں چادر ڈال کر مروڑا، پیٹھ پر اوجھڑی رکھی، ساتھیوں کو گرم ریت پر لٹایا، جناب بن ارت کو انگاروں پر لٹایا، عمارؓ بن یاسر کے خاندان کے ساتھ جو کیا سب کو معلوم ہے۔ ماں کے رکھے ہوئے نام محمدؐ (تعریف کیا گیا) کو بگاڑ کر مذمم کہتے (بخاری) گالیاں دیتے۔ ابولہب نے کہا، ''تیرے ہاتھ ٹوٹیں اور تو ہلاک ہو۔'' کہتے کہ تم 'ابتر' (لاولد) ہو، تمہارا نام لینے والا کوئی نہ ہوگا۔ گویا ناقابل برداشت ظلم سہے۔ کیا ہم ان سب باتوں کے لئے کبھی اپنے باغبان کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ بس درود شریف پڑھ کر سمجھتے ہیں کہ حق ادا ہو گیا۔

لیکن حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ

☆ پھر قرآن کا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم اس کی آیات کے مطالب سمجھیں اور اس کے فرمودات کو اپنے عقیدے اور اپنی عملی زندگی کا حصہ بنائیں۔ قرآن کے بتائے ہوئے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھیں۔ قرآن کی سکھائی ہوئی عبادات پر کاربند رہیں۔ قرآن کے تعلیم کردہ اخلاق و کردار کو اپنائیں۔ ہماری زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں جو احکام قرآن نے دیئے ہیں ان کی اطاعت کریں۔ جو حقوق اللہ اور حقوق العباد قرآن نے ہمیں بتائے ہیں ان پر عمل کریں۔

☆ پھر قرآن کا ہم پر یہ حق ہے کہ اس کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچایا جائے۔ یہی حکم سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کو دیا گیا تھا۔

''اے پیغمبر ﷺ جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ (المائدہ۔٦٧)

نبی کریم ﷺ نے اپنا یہ فریضہ بہترین طریقے سے انجام دیا۔ اور اس میں کوئی کسر آپؐ نے نہ چھوڑی۔ قیامت کے روز حضورؐ اپنی تمام امت کے سامنے کھڑے ہو کر گواہی دیں گے کہ آپؐ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اب یہ امت مسلمہ کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے دائرہ کار میں قرآن کا یہ پیغام لوگوں تک پہنچائیں۔

رسول اللہ ﷺ سے وفاداری و خیر خواہی:

اس میں بھی پانچ چیزیں شامل ہیں۔

آپؐ کی رسالت پر ایمان لانا، آپ کی تعظیم و توقیر کرنا، اطاعت رسولؐ، محبتِ رسولؐ اور آپؐ پر درود و سلام بھیجنا۔

☆ رسولؐ اللہ پر ایمان کے بغیر کوئی شخص فلاح نہیں پا سکتا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''جو لوگ اس رسولؐ پر ایمان لائیں، اس کی حمایت و نصرت کریں اور اس روشنی (یعنی قرآن) کی پیروی کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔ (الاعراف۔١٥٨)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ''قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے۔ اس امت کا (یعنی اس دور کا) جو کوئی بھی یہودی اور نصرانی میری خبر سن لے اور پھر وہ مجھ پر اور میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر جائے تو ضرور وہ دوزخیوں میں ہوگا۔ (مسلم)

نبی کریم ﷺ سید الانبیاء ہیں۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس بلند ترین مرتبے پر فائز کیا ہے جو کسی اور انسان کو نہ کبھی ملا ہے اور نہ ملے گا۔ انسانیت پر آپؐ کا احسان یہ ہے کہ آپ نے اللہ کا پیغام انسانوں تک پہنچایا اور اس منصب نبوت کا حق ادا کرنے میں آپ نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ہمارا فرض ہے کہ اس محسن انسانیت کی تعظیم و توقیر کریں۔ اور آپؐ کی عظمت کا اعتراف کریں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

''اے نبیؐ ہم نے تم کو شہادت دینے والا، بشارت دینے والا اور خبردار کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے تا کہ اے لوگو! تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کا (یعنی رسول کا) ساتھ دو، اس کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔'' (الفتح۔٩،٨)

☆ اطاعت رسولؐ

رسولؐ اس زمین پر اللہ کا نمائندہ ہے اس لیے اس کی اطاعت سب انسانوں پر فرض ہے اور اسی میں ان کی نجات ہے۔ رسول کا انکار کر کے اور اس کی اطاعت سے منہ موڑ کر جو شخص زندگی گزارتا ہے اس کا آخری ٹھکانا جہنم ہے۔ جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ رسول کی اطاعت اصل میں اللہ کی اطاعت ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

''اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسولؐ پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اس کا ذمہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اس کے ذمہ دار تم ہو۔ اس کی اطاعت کرو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے ورنہ رسولؐ کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔ (النور۔۵۴)

''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ گیا تو بہر حال ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔ (النساء۔۸۰)

☆ اتباع رسول کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہر کام اس طریقے سے کریں جیسے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں تعلیم دی ہے اور خود کیا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا ہے اسی طرح حضورؐ کی زندگی کے تمام معمولات اسوۂ حسنہ کی شکل میں محفوظ کر لئے گئے ہیں۔ آپؐ کی زندگی دراصل قرآن کریم کی عملی تفسیر ہے جس سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ قرآن پر عمل کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی عمل قابل قبول ہے جو حضور ﷺ کے طریقے پر کیا جائے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر نبی کریم ﷺ کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر:

''اے محمدؐ کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہی زندگی بخشتا ہے، وہی موت دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمیؐ پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے اور (اتباع) پیروی اختیار کرو اس کی، امید ہے کہ تم راہ راست پا لو گے۔'' (الاعراف۔۱۵۸)

''اے نبیؐ تمہارے لئے اور تمہاری اتباع کرنے والے اہلِ ایمان کے لئے تو بس اللہ کافی ہے۔'' (الانفال۔۶۴)

''(اے نبیؐ) تم ان سے صاف صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور وہ بھی جو میری اتباع کر رہے ہیں، اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں کے ساتھ میرا کوئی واسطہ نہیں۔ (یوسف۔۱۸)

☆ **محبت رسول**

رسول اللہ ﷺ سے محبت کرنا ایمان کا اولین تقاضا ہے۔ انسان کسی سے دو وجوہ کی بنا پر محبت کرتا ہے ایک یہ کہ اس میں اچھی صفات پائی جاتی ہیں، دوسرے یہ کہ وہ اس کا محسن ہو، حضورؐ سے محبت کرنے کی یہ دونوں وجوہ موجود ہیں۔ آپؐ اعلیٰ ترین اخلاق پر فائز ہیں اور آپؐ ساری انسانیت کے محسن ہیں اللہ کی کتاب جو آپؐ پر نازل ہوئی اور آپؐ کے اسوہ حسنہ (سنت رسولؐ) کے ذریعے انسانوں کو وہ ہدایت کا راستہ ملا جس پر عمل کر کے وہ دنیا میں انسانیت کی عظمت اور آخرت میں ابدی فلاح حاصل کر سکتے ہیں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ مجھ سے محبت نہ کرے۔

(بخاری و مسلم)

رسول اللہ ﷺ سے محبت کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ آپؐ کی اطاعت کی جائے اگر کوئی آپؐ کی محبت کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور آپؐ کی اطاعت میں کوتاہی کرتا ہے تو اس کا محبت کا دعویٰ ہی جھوٹا ہے۔ یہی بات ایک اور حدیث میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی ہوائے نفس (نفس کی خواہشات) میری لائی ہوئی ہدایت کے تابع نہ ہو جائے۔

(الشرح السنہ)

قرآن کریم میں اللہ اور رسولؐ کی محبت کو جانچنے کا ایک معیار مقرر کر دیا گیا ہے۔ سورۃ توبہ میں ارشاد ہے:

''اے نبیؐ کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑنے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں تم کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس

کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کو رہنمائی نہیں کرتا''۔

(التوبہ۔۲۴)

☆ **رسول اللہ ﷺ پر درود وسلام:**

حضور سے محبت کے اظہار کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپؐ پر درود و سلام بھیجا جائے۔ یہی اللہ کا بھی حکم ہے:۔

''اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم بھی ان پر درود وسلام بھیجو۔ (الاحزاب۔۴۶)

جب یہ آیت نازل ہوئی تو متعدد صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ آپؐ ہمیں سلام کا طریقہ تو بتا چکے ہیں یعنی نماز میں ہم **اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہٗ** کے وقت **اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ** ہیں مگر آپ پر صلوٰۃ بھیجنے کا کیا طریقہ ہے۔ اس پر آپؐ نے درودِ ابراہیمی کی تعلیم دی جو ہم نماز میں پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی چند ایک درود سکھائے جو اس سے ملتے جلتے ہی ہیں۔

نبی کریم ﷺ پر درود وسلام بھیجنے کی اتنی فضیلت اور اجر ہے کہ آپؐ نے متعدد مرتبہ اس کی تاکید کی۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے تو جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ اس پر دس مرتبہ رحمت نازل کرے گا۔ اس کے دس گناہ معاف کرے گا اور دس درجے بلند فرمائیگا۔ (نسائی)

حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ بخیل ہے وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔ (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھتا ہے میں اس کو سنتا ہوں اور جو شخص دور سے مجھ پر درود بھیجے تو وہ میرے پاس پہنچایا جاتا ہے۔ (بیہقی شعب الایمان)

☆ **ائمہ مسلمین سے خیر خواہی:**

ائمہ مسلمین میں سربراہان مملکت اسلامی، امراء جماعت، گروپ لیڈر، اجتماعی کاموں کے ذمہ داران وغیرہ سب ہی آتے ہیں۔ ان کے ساتھ وفاداری اور خیر خواہی میں درج ذیل باتیں شامل ہیں۔

☆ **معروف میں ان کی اطاعت:**

یعنی اطاعت اس بات سے مشروط ہوگی کہ وہ کسی ایسی بات کا حکم نہ دیں جس میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی ہوتی ہو وہ تم ہی میں سے ہوں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے مطیع ہوں۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو یہی ایک صحیح طریقہ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔'' (النساء۔۵۹)

اولوالامر کے مفہوم میں سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں خواہ وہ علماء ہوں، یا سیاسی رہنمائی کرنے والے لیڈر ہوں، یا ملکی انتظام کرنے والے حکام یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج یا تمدنی اور معاشرتی امور میں قبیلوں، بستیوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار۔ خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند ہے۔ مسلمانوں کے درمیان یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلہ میں بھی نزاع واقع ہوگی اس میں فیصلہ کے لئے قرآن وسنت سے رجوع کیا جائے گا اور جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہوگا اس کے آگے سب سر تسلیم خم کر دیں گے۔

☆ **ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ائمہ مسلمین کی مدد:**

یعنی جو شخص جہاں بھی ہو اس بات کی کوشش کرے کہ اجتماعی کاموں کے لئے جو ضابطے اور ہدایات جاری کی گئی ہیں ان پر صحیح طور پر عمل کیا جائے۔

☆ **ائمہ مسلمین پر حسن ظن:**

جب تک واضح طور پر کوئی برائی سامنے نہ آئے بلاوجہ بدگمانی کرنا افواہوں پر دھیان دینا ایک غلط رویہ ہے۔

☆ **غفلت پر تنبیہ:**

کوئی واضح خرابی یا غفلت سامنے آنے پر ائمہ مسلمین کو اس سے خبر دار کرنا اور مناسب طریقے سے ان کی غلطی کی طرف ان کی توجہ مبذول کرانا تا کہ اس کی اصلاح ہو سکے۔

☆ **اچھے مشوروں سے نوازنا:**

جو لوگ شوریٰ کے ارکان ہوں وہ انتہائی دیانتداری اور خلوص سے ائمہ مسلمین کو اچھے مشورے دیں۔ جو عوام ہوں وہ میڈیا کے ذریعے یا براہ راست رابطے کے ذریعے اچھے مشورے دے سکتے ہیں۔

☆ **عامۃ المسلمین سے خلوص و وفاداری:**

مسلم عوام سے خلوص و وفاداری یہ ہے کہ ان کی ہمدردی اور خیر خواہی کا پورا خیال رکھا جائے۔ ان کا نفع، اپنا نفع اور ان کا نقصان اپنا نقصان سمجھا جائے۔ جائز اور ممکن خدمت اور مدد سے دریغ نہ کیا جائے۔ الغرض علیٰ فرق مراتب ان کے جو حقوق، تعظیم و شفقت، خدمت اور تعاون کے مقرر ہیں ان کو ادا کیا جائے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں۔ جب ملے تو سلام کرے، جب دعوت دے تو قبول کرے، جب چھینک آئے تو الحمد للہ کہے جب بیمار ہو جائے تو عیادت کرے، جب وفات پائے تو جنازہ میں شریک ہو، اور اس کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے کرتا ہے۔ (ترمذی)

اصل میں تو عوام الناس سے خلوص و وفاداری میں سب ہی حقوق العباد آ جاتے ہیں۔ والدین، بیوی، شوہر، اولاد، رشتہ دار، یتیم، ہمسائے، افسر ماتحت، زمیندار، کاشتکار، کارخانہ دار، مزدور، خادم، آقا، آجر، اجیر، امیر، غریب، مسافر، دوکاندار، گاہک، وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کے حقوق اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیئے ہیں ان کی بجا آوری ہی ان کے ساتھ خلوص و وفاداری کا رویہ ہے۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر مقبول احمد شاہد

مسجد نبوی کی کہانی

(۱)

مسجد نبوی کے بارے میں معلومات کا آغاز ہم ظفر بنگش کے ایک مضمون کے ترجمے سے کرتے ہیں۔ یہ مضمون انگریزی ماہنامے کریسنٹ انٹرنیشنل میں شائع ہوا۔ دوسرے حصے میں ہم نے اسی موضوع پر مزید معلومات شامل کی ہیں جن کے لئے انٹرنیٹ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو جو مکہ مکرمہ میں بیت اللہ پر پہلی نظر پڑنے پر رب اعلیٰ کے جلال سے متاثر نہ ہوتا ہو۔ یہ چوکور عمارت جسے اس زمین پر اللہ کے گھر کی حیثیت حاصل ہے ہر مسلمان کو یہ سوچنے کی دعوت دیتی ہے کہ کیا اس نے اپنے اعمال کے ذریعے اپنے آپ کو اللہ کی مغفرت اور رحمت کا مستحق بنالیا ہے یا نہیں اور ہر مسلمان کیلئے اس محترم عبادت گاہ کی زیارت کا یہی مقصد ہے۔

جہاں کعبہ پر پڑنے والی پہلی نظر اللہ کے جلال کا تصور دلاتی ہے۔ وہاں مسجد نبویؐ کے سبز گنبد پر پڑنے والی پہلی نظر ہر مسلمان کا دل محبت اور عقیدت سے لبریز کر دیتی ہے۔ آقائے دو جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری آرام گاہ کے اتنا قریب پہنچ کر کوئی بھی آنکھ نم ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ انہی کی نسبت سے اس مسجد کو مسجد نبوی کہا جاتا ہے۔ وہ شہر جس کا قدیم نام یثرب تھا اب اسی لئے مدینۃ النبیؐ کے نام سے مشرف ہوا کہ آپؐ نے مکہ سے ہجرت کر کے اس شہر کو اپنی قیام گاہ بنا لیا اب اسے عام طور پر مدینہ یا مدینہ منورہ۔ یعنی شہر پرانوار کہا جاتا ہے۔

ہجرت کے بعد مدینہ پہنچتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرام نے وہاں ایک مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بنایا۔ یہ ایک پروقار عمارت تھی۔ جس کی لمبائی 115 فٹ اور چوڑائی 98 فٹ تھی اور اسے پتھروں کی بنیادوں پر مٹی کی دیواروں سے بنایا گیا تھا۔

اس کے بعد بنوامیہ اور بنوعباس کے حکمرانوں نے مسجد نبوی کی مزید توسیع کے منصوبے مکمل کئے۔ 707ء میں بنوامیہ کے حکمران ولید بن عبدالملک نے ساری عمارت کو منہدم کر دیا اور اس کی جگہ ایک نئی اور بڑی مسجد تعمیر کی جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ مبارک کو بھی شامل کر لیا گیا۔ امہات المومنین کے حجرے جو مسجد سے بالکل متصل واقع تھے مسجد کی عمارت کے اندر ہی ضم کر دیئے گئے۔ حضورؐ کے روضہ مبارک اور آپ کے منبر کے درمیان کی جگہ آپؐ کے ارشاد کے مطابق ریاض الجنہ (جنت کا باغ) قرار پائی اور ایک حدیث نبویؐ کے مطابق یہاں مانگی ہوئی دعا رد نہیں ہوتی۔

یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بنوامیہ کے حکمران ولید نے بیت المقدس میں حرم شریف کے احاطے میں مسجد صخرہ بھی تعمیر کی جو مسجد اقصیٰ کے قریب واقع ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ مسجد صخرہ (DOME OF ROCK) اور مسجد اقصیٰ دو الگ الگ عمارتیں ہیں جبکہ بعض لوگ مسجد صخرہ کو ہی مسجد اقصیٰ سمجھتے ہیں۔ خلافت عباسیہ کے دوران عباسی حکمران (775ء تا 785ء) نے مسجد کی عمارت کو شمال کی طرف بڑھاتے ہوئے مزید بڑا کر دیا اور اس میں بیس نئے دروازے بنائے گئے جن میں آٹھ مغربی دیوار میں، آٹھ مشرقی دیوار میں اور چار شمالی دیوار میں تھے۔

مملوک سلطانوں کے دور حکومت میں المنصور قلاون نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ مبارک پر 1279ء میں گنبد تعمیر کر دیا یہ پہلا موقع تھا کہ روضہ پر گنبد بنایا گیا۔ یہ گنبد لکڑی کا بنایا گیا تھا اور اس پر کوئی رنگ نہیں کیا گیا تھا۔ بعد میں اس پر سفید اور نیلا رنگ کر دیا گیا۔ اصل میں کچھ عرصہ کیلئے

گہرا نیلا رنگ ہی نمایاں رہا جو عربوں کا پسندیدہ رنگ تھا۔ المنصور نے باب السلام کے باہر وضو کیلئے ایک فوارہ بھی بنوایا۔ ایک اور مملوک سلطان الناصر محمود نے مسجد کا چوتھا مینار دوبارہ تعمیر کرایا جو کبھی اسی زمانے میں گر گیا تھا۔

پہلی تعمیر میں مسجد کے کچھ حصے پر نمازیوں کیلئے دھوپ اور بارش سے حفاظت کیلئے چھت تعمیر کی گئی جو کھجور کے تنوں اور شاخوں سے بنائی گئی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ذاتی طور پر مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ مسجد کے جنوب کی جانب ایک چبوترہ (صُفّہ) تعمیر کیا گیا جہاں اہل صفہ آ کر بیٹھتے تھے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے انتہائی نادار اور بے گھر لوگ تھے جن کی کفالت آپؐ خود کرتے تھے۔

مسجد کے اس مستطیل احاطے میں تین دروازے تھے۔ جنوب میں باب رحمت، مغرب میں باب جبریل، جس کے قریب جبریل علیہ السلام خدائے ذوالجلال کی طرف سے وحی لیکر آتے تھے اور مشرق میں باب النساء تھا جو خواتین کیلئے مخصوص تھا۔ ابتدا میں بیت المقدس نماز کیلئے قبلہ تھا جو مدینہ سے شمال کی جانب ہے، لیکن جب دو سال بعد قبلہ کا رخ بدل کر مکہ میں کعبۃ اللہ کی جانب کر دیا گیا جو مدینے کے جنوب میں ہے تو پھر اسی حساب سے مسجد میں بھی ضروری ترمیمات کر لی گئیں۔

اس سادہ سی مسجد کی مختلف ادوار میں توسیع کی جاتی رہی۔ پہلی توسیع اس کی تعمیر کے سات سال بعد ہوئی۔ اس کی بلندی گیارہ فٹ تک بڑھا دی گئی اور عرب کے گرم موسم کیلئے اسے زیادہ ہوادار بنا دیا گیا۔ زیادہ توسیع خلفاء راشدین حضرت عمرؓ اور عثمانؓ کے زمانے میں ہوئی۔ حضرت عثمانؓ نے مسجد کی چھت پتھر اور پلاسٹر کی بنا دی اور ستون کھجور کے تنوں کی بجائے پتھر سے تعمیر کر دیئے گئے۔

دو سو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے پر 1481ء میں مسجد نبوی کو ایک خوفناک آگ نے آلیا اور مسجد کی عمارت کا بیشتر حصہ جل کر خاکستر ہو گیا جس میں حضورؐ کے روضے کا لکڑی کا گنبد بھی شامل تھا۔ اس وقت کے مصر کے سلطان اشرف سیاف الدین قیط بے (1468ء تا 1496ء) نے جو تعمیرات کا بہت شوقین تھا۔ مغربی، مشرقی اور جنوبی (قبلہ والی) دیوار دوبارہ تعمیر کروائی۔ اس نے نا صرف مسجد نبوی کی دوبارہ تعمیر کی ذمہ داری نبھائی بلکہ مسجد الحرام مکہ مکرمہ اور مسجد اقصیٰ بیت المقدس میں بھی اہم تعمیرات کرائیں۔ اس کے علاوہ اس نے دمشق، ایپو، سکندریہ اور قاہرہ میں عظیم تعمیراتی منصوبے مکمل کئے۔ اس کے نام سے ایک عظیم قلعہ اب بھی سکندریہ کے شہر میں موجود ہے۔

سلطان قیط بے نے حضورؐ کے روضہ کے گنبد کی بنیاد میں لکڑی کی بجائے اینٹوں کا استعمال کیا تا کہ مستقبل میں ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہے۔ پھر اس نے نئے لکڑی کے گنبد کو ڈھانپنے کیلئے سکے کی پلیٹیں استعمال کیں۔ سلطان کو اس وقت ان کی افادیت کا اندازہ نہیں ہو گا لیکن اس کی اس ترکیب کی وجہ سے کئی صدیوں بعد 1744ء میں جب وہابی فرقہ دہریہ نے حجاز کی طرف یلغار کی تو یہ گنبد ان کے ہاتھوں تباہ ہونے سے محفوظ رہا۔ قیط بے نے نبی کریمؐ کے روضہ مبارک میں بھی وسیع پیمانے پر تجدید کی۔

سبز گنبد

مملوک سلطانوں کے بعد ترکی میں قائم ہونے والی خلافت عثمانیہ نے جزیرہ نمائے عرب کا کنٹرول سنبھالا۔ اس میں حجاز کا علاقہ بھی شامل تھا جس میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے مقدس شہر واقع ہیں۔ ان کی سلطنت میں فلسطین بھی شامل تھا جو اس وقت شام (سیریا) کا ایک صوبہ تھا جس میں موجودہ لبنان اور اردن بھی شامل تھے۔ عثمانی خلفاء نے حجاز کا نظم ونسق اپنے گورنروں کی مدد سے جنہیں ''شریف'' کہا جاتا تھا۔ 1517ء سے پہلی جنگ عظیم 1918ء تک چلایا۔ جنگ عظیم کے نتیجے میں خلافت عثمانیہ ختم ہو گئی اور انگریزوں نے اس علاقے کا انتظام بالآخر سعودی خاندان کے سپرد کر دیا۔ خلافت عثمانیہ کے حکمران نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ مبارک کی اس عمارت کے ساتھ رہنے والوں میں خاص عقیدت اور احترام کے جذبات رکھتے تھے جیسا کہ ہر مسلمان کیلئے لازم ہے۔ وہ مسجد نبویؐ اور خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ مبارک پر انتہائی عزت واحترام سے حاضری دیتے۔ یہاں تک کہ مسجد نبوی کی توسیع کے کام کے دوران وہ اس بات کا بے حد خیال رکھتے کہ ہر کام بہت احترام اور احتیاط سے کیا جائے اور ذہن میں ہر وقت یہ احساس تازہ رہے کہ یہاں اللہ کے رسول محو استراحت ہیں اور

کسی سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جو آنحضور کے سامنے کسی بھی طرح بے ادبی تصور کی جاسکتی ہو۔

یہ 1818ء کا واقعہ ہے کہ عثمانی خلیفہ محمد دوم نے وہ سبز گنبد تعمیر کیا جو نبی پاکؐ کے روضہ مبارک کی چھت پر آویزاں ہے۔ یہ اسی گنبد کے اوپر بنایا گیا ہے جو مملوک سلطان قیط بے نے 1481ء میں تعمیر کیا تھا۔ سبز رنگ کا یہ گنبد روضہ پاک کو مسجد نبوی کی اصل عمارت سے ممیّز کرتا ہے کیوں کہ مسجد کے گنبدوں کا رنگ سلور ہے روضہ مبارک کے گنبد پر سبز رنگ پہلی مرتبہ 1837ء میں کیا گیا تھا اور اس وقت سے ایسے ہی ہے اور مسجد نبوی کے ان متعدد گنبدوں سے مختلف نظر آتا ہے جو سلور رنگ کے ہیں اور مسجد کی چھت پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

سال 2007ء میں سعودیوں نے گنبد کو سلور رنگ میں پینٹ کرنے کی کوشش کی تا کہ اس کا رنگ مسجد نبوی کے گنبدوں جیسا ہو جائے۔ مدینہ کے شہریوں نے اس حرکت کو سعودی حکومت کا غیر ضروری فعل قرار دیا اور ایک غیر متوقع طور پر شدید احتجاج نے مدینہ کی میونسپلٹی کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اسے دوبارہ اس کے اصلی سبز رنگ میں بحال کر دیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مدینہ کی میونسپلٹی کو سبز گنبد پر سلور رنگ چڑھانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی جس کے نتیجے میں مسجد نبوی کے دوسرے گنبدوں کے مقابلے میں اس کی امتیازی حیثیت ختم ہو جاتی۔

خلافت عثمانیہ کے حکمرانوں نے مسجد نبوی اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو مسجد کے جنوب مشرقی کونے پر واقع ہے کا بے حد احترام کیا۔ سلطان سلیمان معظم (1520ء تا 1566ء) نے مسجد نبوی کی مغربی دیواریں بنوائیں اور شمال مشرقی کونے کا مینار تعمیر کرایا جو ''سلیمانیہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محراب (الشافعیہ) کے ساتھ ایک اور محراب (الاحناف) بنوائی۔ اس نے سیسے کی تختیوں سے ڈھانپا ہوا ایک گنبد روضہ رسولؐ کے گنبد کے اوپر مزید ڈال دیا۔

سلطان عبدالمجید (1839ء تا 1861ء) نے تمام مسجد نبوی کو نئے نقشے کے مطابق دوبارہ تعمیر کیا اور اس کو بے حد بڑا کر دیا۔ لیکن اس نے روضہ رسولؐ، تینوں محرابوں، منبر اور سلمانیہ مینار کو ان کی اصل حالت پر رہنے دیا۔ جنوب کی جانب مسجد کی عمارت کو توسیع دے کر چوڑائی میں دگنا کر دیا گیا اور چھت پر ایک ہی پیمائش کے چھوٹے چھوٹے گنبد پھیلا دیئے گئے۔ محراب کے علاقہ میں باب السلام کے اوپر اور روضہ رسولؐ پر بنے ہوئے گنبد اس تبدیلی سے مستثنیٰ رہے۔ سلطان عبدالمجید نے مسجد نبوی کی تعمیر کے کام میں ایک حیرت انگیز احتیاط یہ برتی کہ یہ سارا کام نوجوان حفاظ قرآن کی ایک ایسی جماعت سے کرایا گیا جنہیں بچپن سے ہی قرآن حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی سلطنت کے بہترین انجینئروں اور کاریگروں سے تعمیراتی کام کی تربیت دلائی گئی تھی۔ یعنی حفّاظ کی یہ نسل خاص طور سے مسجد نبویؐ کی تعمیر کیلئے تیار کی گئی تھی۔

مسجد میں استعمال ہونے والا رنگ و روغن سلطان عبدالمجید کے ہنرمند کاریگروں نے ان درختوں سے حاصل کیا جو ایسے جنگلات سے کاٹے گئے تھے جو اس سے پہلے انسان کی دست برد سے ہمیشہ محفوظ رہے تھے۔ سلطان کی ہدایت کے مطابق مدینہ سے باہر ایک پورا شہر تعمیراتی کام کیلئے بنایا گیا، جہاں مسجد نبوی کی تعمیر میں استعمال ہونے والا پتھر اور دوسرا ساز و سامان بنایا، کاٹا اور تراشا جاتا۔ اس نے یہ حکم بھی جاری کیا کہ تمام کاریگر اور ہنرمند جو کہ سب کے سب حفّاظ قرآن تھے ہر وقت وضو کی حالت میں رہیں اور مسجد کی تعمیر میں مصروف کار ہونے کے دوران قرآن کی تلاوت کرتے رہیں۔

مسجد کی چھت کے گنبد اندر کی طرف سے قرآنی آیات اور قصیدہ بردہ شریف کے اشعار سے مزین کیے گئے۔ قصیدہ بردہ شریف حضورؐ کی چادر کا قصیدہ ہے جو مراکش کے صوفی شاعر شیخ البصیری نے لکھا تھا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ شیخ فالج کے مرض میں مبتلا تھے تو ایک رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے خواب میں آئے اور اپنی چادر ان پر ڈال دی۔ شیخ سو کر اٹھے تو ان کا مرض دور ہو چکا تھا۔ شیخ البصیری نے پھر یہ قصیدہ لکھا جس کا اصل عنوان الکواکب الدریہ فی مدح خیر البریہ ہے۔

سلطان عبدالمجید نے قبلہ کی جانب جنوبی دیوار پر چمکدار ٹائلیں بھی لگوائیں جن پر قرآن کی آیات لکھی ہوئی تھیں۔ مسجد اور صحن کا فرش سنگ مرمر کی ٹائیلوں اور سرخ پتھر سے بنایا گیا اور مسجد کی عمارت میں

ایک پانچویں مینار کا مغرب کی جانب اضافہ کیا گیا جس کا نام مینار مجیدیہ رکھا گیا۔

☆.....☆.....☆

(۲)

مسجد نبویؐ کی توسیع سعودی دور میں

1932ء میں سعودی دور حکومت کی بنیاد رکھے جانے کے بعد مسجد نبوی کی عمارت میں کئی بڑی تبدیلیاں کی گئیں۔ 1951ء میں شاہ ابن مسعود (1932ء تا 1953ء) نے مسجد کے گرد کئی عمارات کو منہدم کرنے کا حکم دیا، تاکہ مشرق اور مغرب کی جانب نماز پڑھنے کے ہال میں توسیع کی جا سکے۔ اس طرح جو نئی عمارت بنائی گئی وہ کنکریٹ کے ستونوں اور نوک دار محرابوں پر مشتمل تھی۔ پرانے ستونوں کو کنکریٹ کے غلاف بنا کر مزید مضبوط کر دیا گیا اور ان کے اوپر کے سروں کو تانبہ چڑھا کر خوبصورت بنا دیا گیا۔ سلیمانیہ اور مجیدیہ مینار مسمار کر کے ان کی جگہ مملوک دور کے میناروں کے مشابہ نئے مینار بنا دیئے گئے۔ اس کے علاوہ دو نئے میناروں کا عمارت کے شمال مغربی اور شمال مشرقی کونوں میں اضافہ کیا گیا۔ مسجد کی مغربی دیوار کے ساتھ ایک لائبریری تعمیر کی گئی جہاں قرآن کریم کے نایاب تاریخی نسخے اور دیگر دینی کتابیں رکھی گئیں۔

1973ء میں سعودی فرمانروا شاہ فیصل بن عبدالعزیز نے مسجد کی مغربی جانب عارضی تعمیرات کروائیں تاکہ نمازیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کیلئے جگہ مہیا کی جا سکے۔ 1981ء میں اس جانب مسجد کی مستقل توسیع کی گئی جس سے مسجد کے تعمیر شدہ رقبے میں پانچ گنا اضافہ ہو گیا۔

ماضی قریب میں توسیع کا عظیم منصوبہ شاہ فہد کے دور میں مکمل کیا گیا، جس سے مسجد میں نمازیوں کیلئے گنجائش میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ مسجد میں جدید آسائشوں کا انتظام کیا گیا جن میں ایئر کنڈیشنگ اہم ہے۔ مسجد کی چھت میں 27 ایسے گنبد بنائے گئے جو متحرک ہیں اور اپنی جگہ سے کھسکائے جا سکتے ہیں۔

☆ پہلی سعودی توسیع (1368ء تا 1375ء)

اس کا آغاز شاہ عبدالعزیز نے اور تکمیل شاہ سعود بن عبدالعزیز نے کی۔ اس کا سنگ بنیاد اب بھی پرانے باب شاہ سعود کے قریب دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ پتھر سعود بن عبدالعزیز نے نصب کیا تھا اور اس پر یہ الفاظ کندہ ہیں:

''شاہ سعود نے یہ چار پتھر نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقوش قدم پر نصب کئے اور یہ کام ماہ ربیع الاول 1373ء میں ہوا۔''

توسیع کے دوران اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ نئی تعمیرات کا ڈیزائن پرانے ترکی ڈیزائن ہی کی طرح کا ہو تاکہ دونوں میں کوئی نمایاں فرق نظر نہ آئے۔ اس وقت مسجد نبویؐ کے پانچ مینار تھے۔ ان میں سے تین ہٹائے گئے ان میں سے ایک مینار باب رحمت پر تھا۔ باقی دو (مینار عثمانیہ اور مینارِ مجیدیہ) عمارت کی شمالی جانب تھے۔ سعودی حکومت نے دو نئے مینار عمارت کی شمالی دیوار کے کونوں پر تعمیر کروائے۔ اس طرح اس توسیع کے بعد میناروں کی کل تعداد چار ہو گئی۔ اس نئی تعمیر میں کل توسیع شدہ رقبہ 91x189 مربع میٹر تھا اور یہ توسیع ترکوں کی تعمیر شدہ توسیع کے صحن کے شمال کی جانب کی گئی تھی۔

اس توسیع کے بعد بھی حجاج کیلئے مسجد میں جگہ کی گنجائش کافی نہیں تھی۔ شاہ فیصل نے مسجد سے ملحق جائیداد پچاس ملین ریال میں لوگوں سے خرید لی۔ اس نے اس جگہ 35,000 مربع میٹر رقبے پر فائبر کی چھتیں تعمیر کر دیں جن کے اندر روشنی اور پنکھوں کا عمدہ انتظام کیا گیا۔ اس مسقّف علاقے کو کنگ عبدالعزیز لائبریری تک پھیلا دیا گیا۔ پھر بعد میں نئے توسیعی منصوبوں کے دوران یہ ڈھانچہ ہٹا دیا گیا۔

شاہ فہد بن عبدالعزیز مسجد نبویؐ میں ایک بڑی توسیع کے ہمیشہ خواہاں رہے جیسے کہ انہوں نے مکہ مکرمہ میں مسجد الحرام کی توسیع کا منصوبہ مکمل کیا۔ انہوں نے مسجد نبویؐ کی توسیع کیلئے باب السلام کے قریب خود اپنے ہاتھ سے سنگ بنیاد نصب کیا جس پر یہ الفاظ رقم ہیں۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''

(اللہ کے نور کی طرف ہدایت پانے والے) ان گھروں

(مسجدوں) میں پائے جاتے ہیں جن میں اپنی یاد کا حکم اللہ نے دیا ہے ان میں یہ لوگ صبح وشام اس کی تسبیح کرتے ہیں۔(النور۔۳۶)

خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز نے مسجد نبوی کی تعمیر وتوسیع (دوسری سعودی توسیع) کے منصوبے کی بنیاد بروز جمعہ ۹ صفر ۱۴۰۵ھ (2 نومبر 1984ء) کو رکھی۔''

اس طرح اس تعمیراتی منصوبے کی تکمیل پر شاہ فہد نے ایک اور پتھر باب بلال کے نزدیک نصب کیا جس پر یہ الفاظ رقم ہیں:۔

''خدائے ذوالجلال کے بابرکت نام سے اور اسی کی رحمت وتوفیق سے خادم الحرمین الشریفین فہد بن عبدالعزیز نے مسجد نبوی کے توسیعی منصوبہ کی تکمیل پر آج بروز جمعۃ المبارک 4 ذیقعد 1414ھ (15 اپریل 1994ء) دین اسلام اور اہل اسلام کی خدمت کیلئے آخری پتھر نصب کیا۔ تمام تعریفیں اللہ سبحانہ تعالیٰ کیلئے ہیں جو اس کائنات کا خالق ہے۔''

مسجد نبویؐ کے بارے میں درج ذیل معلومات قارئین کیلئے دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

خلافت عثمانیہ (ترکی) تک مسجد کا مسقّف رقبہ۔4056 مربع میٹر

پہلی سعودی توسیع کا رقبہ 12270 مربع میٹر۔

ترکی اور سعودی توسیع تک کل رقبہ 16326 مربع میٹر۔

اس وقت تک نمازیوں کی گنجائش 28,000 نمازی۔

دوسری سعودی توسیع کے بعد۔

فرش کا کل رقبہ:98326 مربع میٹر

چھت کا رقبہ:67000 مربع میٹر

گنبدوں کے نیچے رقبہ:8750 مربع میٹر

چھت پر نمازیوں کیلئے جگہ:58250 مربع میٹر

اس طرح صرف چھت پر اس وقت 90,000 نمازی سما سکتے ہیں۔نمازیوں کیلئے کُل دستیاب رقبہ:156576 مربع میٹر۔اس رقبہ میں 2,68,000 نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔اس طرح دوسری سعودی توسیع کے بعد پہلی سعودی توسیع کے مقابلے میں 9 گنا زیادہ نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ مسجد کے گرد کھلے صحن ہیں جو نمازیوں کیلئے خاص طور سے ڈیزائن کئے گئے ہیں۔اس کھلی جگہ کا کل رقبہ 2,35,000 مربع میٹر ہے جس میں سے 1,35,000 مربع میٹر رقبہ نماز کی ادائیگی کیلئے استعمال ہوسکتا ہے جس میں 4,30,000 نمازی سما سکتے ہیں۔اس طرح دوسری سعودی توسیع کے بعد مسجد اور باہر کے کھلے صحن 6,98,000 نمازیوں کیلئے کافی ہیں۔

☆مصلیٰ النّساء

توسیع شدہ مسجد کے دونوں شمالی کونوں میں خواتین کیلئے وسیع جگہ مختص کی گئی ہے جسے باقی مسجد سے پختہ قناتوں کے ذریعے الگ کر دیا گیا ہے۔ان کیلئے مسجد میں داخل ہونے کے دروازے بھی الگ ہیں۔ خواتین کی مسجد جو شمال مشرقی کونے میں واقع ہے اس کا رقبہ 16 ہزار مربع میٹر ہے اور شمال مغربی کونے پر واقع مسجد کا رقبہ 8 ہزار مربع میٹر ہے۔

مسجد کے سب دروازوں پر درمیان میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھا ہوا ہے اور اوپر کے کنارے پر اُدخلُوھا بسلم امنین (مسجد میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ) لکھا ہے۔مسجد کی تمام کھڑکیوں پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا ہے۔

ذیل میں شاہ فہد کے دور کی اس دوسری توسیع کے کچھ خاص امتیازات بیان کیے گئے ہیں۔

☆متحرک گنبد

مسجد کے اندر قدرتی تازہ ہوا مہیا کرنے کیلئے عمارت کی چھت میں 27 متحرک گنبد بنائے گئے ہیں جنہیں برقیاتی نظام سے کمپیوٹر کے ذریعے کھولا اور بند کیا جا سکتا ہے۔ان کو کھولنے اور بند کرنے سے کوئی آواز پیدا نہیں ہوتی۔یہ گنبد بے حد خوبصورت اور ہر گنبد پر 2½ کلوگرام سونے سے نقوش بنائے گئے ہیں۔

☆متحرک اور جامد سیڑھیاں

مسجد کی عمارت میں 6 متحرک برقی سیڑھیاں بنائی گئی ہیں جو نمازیوں کو زمینی سطح سے مسجد کی چھت پر لے جاتی ہیں اس کے علاوہ 18

عام سیڑھیاں اسی مقصد کیلئے بنائی گئی ہیں۔

☆ **مینار**

مسجد کی عمارت کی توسیع میں 6 نئے مینار بنائے گئے ہیں۔ ان میں 4 مینار عمارت کے چاروں کونوں پر واقع ہیں اور دو باب فہد پر بنائے گئے ہیں۔ ان کا ڈیزائن پہلی سعودی توسیع کے میناروں سے ملتا جلتا ہے۔ ان میں سے ہر مینار 104 میٹر لمبا اور پہلی توسیع کے میناروں سے 32 میٹر زیادہ بلند ہے۔

☆ **تہہ خانہ**

تہہ خانہ کل رقبہ 82,000 مربع میٹر ہے اور اس کی چھت 4 میٹر بلند ہے۔ اس میں 2554 ستون ہیں اور داخل ہونے کے 8 دروازے ہیں۔ تہہ خانہ میں تمام سہولیات کے کنٹرول روم ہیں، مثال کے طور پر ائرکنڈیشننگ، پانی کا نظام، آگ بجھانے کا نظام، ٹھنڈے پانی کا ذخیرہ، ٹیلی فون، ریڈیو، ٹیلی ویژن، نشریات اور مسجد میں جگہ جگہ لگائے گئے نگران کیمروں کا کنٹرول۔

☆ **ایئرکنڈیشننگ**

مسجد نبویؐ کا ایئرکنڈیشنگ سسٹم دنیا بھر میں سب سے بڑا، جدید ترین اور بے مثال سسٹم ہے۔ اس کی ایک انوکھی بات یہ ہے کہ اس کا ایئرکنڈیشنگ پلانٹ مسجد سے کئی کلومیٹر دور واقع ہے۔ اس طرح مشینوں کا شور مسجد کے معمولات میں مخل نہیں ہوتا۔ پلانٹ 200x350 یعنی 70,000 مربع میٹر کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں بجلی کے 8 جنریٹر ہیں جن میں 7 مسجد کیلئے ہیں اور ایک زیرزمین پارکنگ کیلئے ہے۔ ہر مشین کی الیکٹرک پاور 2½ میگاواٹ ہے۔ ان میں 4 جنریٹر ہر وقت چلتے ہیں۔ باقی تین Stand by کے طور پر موجود رہتے ہیں۔

6 پلانٹ ایئرکنڈیشنگ کے پانی کو ٹھنڈا کرنے کیلئے لگائے گئے ہیں۔ ہر پلانٹ 3,400 ٹن پانی ٹھنڈا کرسکتا ہے۔ ہر پلانٹ 3,400 گیلن پانی ایک منٹ میں ٹھنڈا کرتا ہے۔ پانچ پلانٹ ہر وقت چلتے رہتے ہیں جبکہ چھٹا پلانٹ Stand by کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ 7 موٹریں اس پانی کو مسجد نبوی تک زیرزمین پائپوں اور سرنگ کے ذریعے پہنچانے کیلئے استعمال ہوتی ہیں۔ یہ سرنگ تقریباً 4 میٹر گہری، 6 میٹر چوڑی اور 7 کلومیٹر لمبی ہے۔ یہ سرنگ گاڑیوں کے گزرنے کیلئے بنائی گئی سرنگ کے نیچے سے مسجد کے مغربی جانب سے گزرتی ہے یہ بہت گہرائی میں واقع ہے تاکہ آئندہ ہونے والے کسی تعمیراتی کام میں رکاوٹ نہ بنے۔ اس وقت اسی سرنگ میں پانی لے جانے والے دو پائپ موجود ہیں لیکن مستقبل کی ضروریات کیلئے مزید پائپ ڈالنے کی گنجائش موجود ہے۔

☆ **کار پارکنگ**

زیرزمین دو منزلوں میں کار پارکنگ کا انتظام کیا گیا ہے۔ یہ پارکنگ مسجد نبویؐ کے اردگرد شمال، جنوب اور مغرب میں کھلے صحن کے نیچے واقع ہے اس کا کل رقبہ 2,90,000 مربع میٹر ہے۔ اس میں 4444 گاڑیاں بیک وقت پارک کی جاسکتی ہیں جبکہ ان کے علاوہ 44 خصوصی پارکنگ کیلئے جگہ بھی بنائی گئی ہے۔ اس طرح زیریں تہہ خانے میں بھی 2222 گاڑیاں پارک کی جاسکتی ہیں اور 22 خصوصی پارکنگ کی جگہیں ان کے علاوہ ہیں۔ تہہ خانے کی اوپر کی منزل کی اونچائی تقریباً 5 میٹر ہے اور نیچے کی منزل 4 میٹر اونچی ہے۔

زیرزمین پارکنگ میں آمدورفت کیلئے 6 راستے بنائے گئے ہیں، تین اوپر کی منزل کیلئے تین نیچے کی منزل کیلئے ان میں سے 4 راستے اوپر اور نیچے کی منزلوں کو آپس میں ملاتے ہیں۔ یہ چاروں راستے مسجد کے چاروں کونوں کے قریب واقع ہیں۔

پارکنگ ایریا میں ٹیلی ویژن کیمرے وہاں موجود اور متحرک گاڑیوں کی نگرانی کیلئے نصب کئے گئے ہیں۔ ان کیمروں کے ذریعے کنٹرول روم سے ڈرائیور حضرات کو گاڑی مناسب جگہ صحیح طریقے سے پارک کرنے کیلئے ہدایات دی جاسکتی ہیں۔ روزانہ داخل ہونیوالی اور باہر نکلنے والی گاڑیوں کی تعداد کی نگرانی بھی اس طرح کی جاسکتی ہے۔ یہ سب انتظامات اس لئے کئے گئے ہیں کہ اس زیرزمین پارکنگ ایریا میں غیر ضروری رش اور افراتفری پیدا نہ ہو۔

☆ **پبلک سروسز**

نمازیوں کے وضو کیلئے 15 بڑے ہال بنائے گئے ہیں۔ ہر ہال

☆.....☆.....☆

میں 4 منزلیں اور 2 دروازے ہیں۔ ہر منزل کیلئے خودکار اور جامد سیڑھیاں مہیا کی گئی ہیں۔ انہی سیڑھیوں سے زیرزمین پارکنگ کو بھی راستہ جاتا ہے۔ ہر ہال میں 336 غسل خانے ہیں جن میں کچھ غسل خانوں میں مغربی طرز کے کموڈ بھی مہیا کئے گئے ہیں ہر ہال میں بجلی کا انتظام، پانی ذخیرہ کرنے کی جگہ، صاف ہوا مہیا کرنے کا انتظام اور آگ بجھانے کے آلات مہیا کیے گئے ہیں۔

مسجد کے متعدد صحن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ صحن ترکی اور سعودی توسیع کے درمیان واقع ہیں۔ ان میں 16 دیوقامت چھتریاں زیادہ گرمی اور زیادہ سردی روکنے کیلئے لگائی گئی ہیں اور بے حد خوبصورت منظر پیش کرتی ہیں۔ ایئر کنڈیشنگ اور سورج کی روشنی اس کھلی جگہ میں بھی نمازیوں کی ضرورت کے مطابق مہیا کی گئی ہے۔

مسجد کے ایک اور ہال کا خاص ذکر کرنا ضروری ہے۔ یہ مسجد کے جنوب میں باب بقیع سے باب السلام تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ تقریباً 88 میٹر لمبا اور 5 میٹر چوڑا ہے اور اس کے چار دروازے ہیں۔ اس کے جنوبی دروازے سے وفات پانے والے مسلمانوں کو نماز جنازہ کی ادائیگی کیلئے لایا جاتا ہے۔ ایک دروازہ مسجد کے بڑے ہال میں کھلتا ہے۔

آخر میں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ایک لائبریری باب مجیدیہ کے دونوں طرف واقع ہے۔ ایک طرف کو باب عثمان کہا جاتا ہے جس میں کتابوں اور قرآن کریم کے نایاب نسخے رکھے گئے ہیں۔ دوسری طرف کو باب عمر کہا جاتا ہے جس میں قدیم نوادرات اور مسلم حکمرانوں کے بھیجے ہوئے نوادرات رکھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں جگہیں عموماً پبلک کیلئے معمول کے اوقات کار میں کھول دی جاتی ہیں۔

اس طرح شاہ فہد کی اس دوسری سعودی توسیع کے ذریعے مسجد نبویؐ میں آنے والے نمازیوں کیلئے آرام اور سہولتوں میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ یہ توسیعی عمل جو شاہ عبدالعزیز نے شروع کیا اور پھر اُسے شاہ سعود، شاہ فیصل اور شاہ فہد نے جاری رکھا آئندہ بھی نمازیوں کی ضرورت کے مدنظر جاری رہے گا۔

نذرانۂ عقیدت!

آپؐ سراپا صبر و رضا ہیں
ہم کہ مسافرِ دشتِ بلا ہیں
آپؐ ہمارے راہ نما ہیں
زخم کشیدہ، آبلہ پا ہیں

آپؐ ہیں تفسیرِ قرآنی
آپؐ سے دعویٰ عشق کریں کیا
علم و رُشد کا سرچشمہ ہیں
ہم تو طلبگارِ دنیا ہیں

آپؐ سے نسبت ہم کو بھی ہے
ہم ہیں مجسم پیکرِ غفلت
آپؐ سے ہم بھی وابستہ ہیں
تصویرِ تقصیر و خطا ہیں

لیکن آپؐ نے جو بھی دیا تھا
کس منہ سے تیرے کہلائیں
نقشِ قدم جو بھی چھوڑا تھا
ہم جو زمانے میں رسوا ہیں

آج اسے ہم بھول چکے ہیں
مانگ رہے ہیں تجھ سے معافی
اس رستے سے دور ہوئے ہیں
اپنے کیے پر شرمندہ ہیں

شمیم فاطمہ

سیّدہ عائشہ صدیقہؓ!

مادرِ اسلام بی بی عائشہؓ
طیبہ و طاہرہ و حاذقہ

اُمّہاتُ المومنین میں منفرد
عورتوں میں ہیں عظیم المرتبہ

آپؓ سے مروی حدیثیں بے شمار
آپؓ نے پایا غضب کا حافظہ

باوقار و بانصیب و باحیا
علم میں یکتا، ہُنر میں کاملہ

دسترس رکھتی تھیں ہر میدان میں
طب و تاریخ و علومِ دینیہ

ذی شعور و متّقی و صابرہ
شاعرہ و عالمہ و فاضلہ

دی گواہی آپؓ کی قرآن نے
کی خدا نے خود برأتِ عائشہؓ

آپؓ کے ہمدم طبیعت آشنا
آپؐ سے خوش تاجدارِ انبیاءؐ

عمر بھر انؓ کے رہا پیشِ نظر
دین حق کی سالمیت اور بقا

عائشہؓ مینارۂ صبر و رضا
محسنہ ملتِ اسلامیہ

دخترِ صدیق اکبر السلام!
مرحبا اے مصطفیٰؐ کی اہلیہؓ!!

شمیم فاطمہ

نعت

یہ آنسو دل پہ گرتے کیوں نہیں ہیں رحمت عالمؐ
یہ دل آخر پگھلتے کیوں نہیں ہیں رحمت عالمؐ

سروسامان کم ہے دشمنوں کی پیش قدمی ہے
ہمیں بدرواحد درپیش ہے پھر رحمتِ عالمؐ

فقط اک آپؐ کا نقشِ قدم ہے جس پر چلنے میں
بھلائی دونوں عالم کی ہے مضمر رحمتِ عالمؐ

گڑھے میں آگ کے گرنے سے روکے کون اب ہم کو
کہاں اب آپ کا ہے دستِ الفت رحمتِ عالمؐ

ہمیشہ آپ پر بھیجے درودِ پاک یہ امت
ہمیشہ آپ پر ہو رب کی رحمتِ، رحمت عالمؐ

بشریٰ فیصل

غزل

فرصت کہاں تھی مونس و غمخوار ڈھونڈتے
گزری ہے بس کہ عمر درِ یار ڈھونڈتے

میں ڈھونڈتا ہوں راحت وفرصت کی ساعتیں
رہتے ہیں مجھ کو رنجش و آزار ڈھونڈتے

شب بھر رہی ہے لمحہ تسکین کی تلاش
اور دن گیا ہے سایہ دیوار ڈھونڈتے

یہ صورت خراب، یہ حالات دیکھیے
پھرتے ہیں رہ میں نامہ دلدار ڈھونڈتے

اس عالم فریب میں کھوئی تھی جو صہیب
ہم رہ گئے وہ ساعتِ دیدار ڈھونڈتے

صہیب اکرام۔ملتان

کوئی ہے جو مجھے روکے

حیدر علی خان نے بڑے ارمان سے اپنا چھوٹا سا گھر بنوایا تھا۔ ان کے والدین کی وفات کے بعد ان کا موروثی گھر بیچا گیا تھا اور سب بہن بھائیوں کو ان کے حصہ کی رقم مل گئی تھی۔ یہ پیسے ملنے کے بعد حیدر علی خان کو اپنے گھر کی تعمیر کا خواب پورا ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ انہوں نے اس رقم سے شہر کے قدرے پسماندہ علاقہ میں پانچ مرلہ زمین خرید لی۔ زمین خریدنے کے بعد جو رقم بچی، اس سے گھر بنانے کی ابتدا تو کی جا سکتی تھی لیکن اسے مکمل کرنے کا خواب پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس کشمکش میں تھے کہ گھر کی تعمیر شروع کی جائے یا نہیں۔ جب بھی وہ اپنی بیگم سے اس موضوع پر بات کرتے تو وہ ہمیشہ یہی کہتیں،

''خان صاحب! گھر پیسے سے نہیں، نیت سے بنتے ہیں۔ ہمیں کون سا تاج محل کھڑا کرنا ہے۔ آپ ابتدا تو کریں آگے اللہ مالک ہے۔''

اس کے جواب میں حیدر علی خان ایک گہری اور لمبی ہونہہ کر کے خاموش ہو جاتے۔ دو تین دن کے بعد میاں بیوی کے درمیان پھر یہی موضوع زیرِ بحث آ جاتا اور بالآخر حیدر علی خان کی لمبی ہونہہ پر بات ختم ہو جاتی۔

حیدر علی خان صاحب ریلوے کے محکمہ میں کلرک تھے۔ لگی بندھی آمدن تھی۔ بمشکل گزارا ہوتا تھا۔ ان کے دو بیٹے لیاقت اور شوکت زیرِ تعلیم تھے۔ ان کی بیگم صابرہ خاتون دھیمے مزاج کی سمجھدار خاتون تھیں۔ بچے جوں جوں بڑے ہو رہے تھے، اخراجات بھی بڑھ رہے تھے۔ چنانچہ حیدر علی خان نے روزانہ شام کو ایک ڈاکٹر کے پرائیویٹ کلینک پر جانا شروع کر دیا۔ وہ ریلوے کے دفتر سے چھٹی کے بعد گھر لوٹتے اور کھانا کھاتے ہی کلینک کی راہ لیتے۔ ڈاکٹر صاحب کی آمد سے پہلے وہ اپنی زیرِ نگرانی کلینک کو صاف کروا کر اسے تیار کر دیتے۔ جب مریضوں کی آمد آمد ہوتی تو ان کی باری کے حساب سے انہیں ٹوکن پکڑا دیتے۔ مریضوں سے فیس وصول کرتے۔ ڈاکٹر صاحب رات گیارہ بجے تک کلینک میں بیٹھتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد حیدر علی خان کلینک کو بند کر کے اپنی پرانی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گھر کی راہ لیتے۔

ان کی تین بہنیں تھیں۔ تینوں بیاہی ہوئی تھیں اور اپنے اپنے گھروں میں خوش باش تھیں۔ منجھلی بہن کے میاں لوہے کا کاروبار کرتے تھے۔ روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ باقی دونوں بہنوں کے میاں سرکاری ملازم تھے اور ان کا گزارا بھی اچھا ہو رہا تھا۔ بہت غور و خوض کے بعد حیدر علی خان اس نتیجے پر پہنچے کہ اللہ کا نام لے کر گھر بنانے کی ابتداء کر دی جائے۔ چھتوں پر اگر لینٹر نہ ڈالے جائیں بلکہ اس کی بجائے بازار سے تیار شدہ چھتیں خرید لی جائیں، کھڑکیاں دروازے لکڑی کی بجائے لوہے سے بنوائے جائیں، کمروں کے فرش باریک چپس کی مدد سے بنائے جائیں اور گھر کا آنگن اینٹوں سے بنایا جائے تو کم سے کم خرچ میں مختصر سا گھر بن جائے گا۔ تعمیر کے دوران اگر پیسوں کی کمی کا سامنا ہوا تو ریلوے کے محکمہ سے کچھ رقم بطور قرض لے لی جائے گی، جو اگلے پندرہ سال کے عرصہ میں ان کی ماہوار تنخواہ میں سے کٹتی رہے گی۔ چنانچہ اس فیصلے کے بعد گھر بننا شروع ہو گیا۔

گھر تکمیل کے مراحل میں تھا کہ پیسے ختم ہو گئے۔ حیدر علی خان نے اپنے محکمہ کو قرض حاصل کرنے کیلئے درخواست دیدی۔ منجھلی بہن کو صورتحال کا علم ہوا تو وہ اپنے میاں کی رضامندی سے اپنے حصے کے پیسے لے کر بھائی کے پاس پہنچ گئیں اور یہ کہہ کر پیسے ان کے ہاتھ پر رکھ دیئے کہ۔

''بھائی! مجھے بے حد خوشی ہوگی اگر آپ ان پیسوں سے اپنا گھر مکمل کرلیں''۔

حیدر علی خان خوددار آدمی تھے۔انہوں نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ان کی بہن مصر ہوگئیں اور کہنے لگیں،

''آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ گھر صرف آپ کا اور بھابھی کا ہے۔ بھائی آپ بھول رہے ہیں۔اس گھر میں میرا بھی حصہ ہے۔اس گھر پر میرا بھی حق ہے۔یہ گھر میرا مان ہے۔یہی گھر میرا میکہ ہے۔آپ انکار کر کے مجھے اس احساس سے محروم نہ کریں۔مجھے میرے حق سے محروم نہ کریں۔''

لیکن بہن کی یہ درخواست بھی بے اثر رہی اور حیدر علی خان نے پیسے لوٹاتے ہوئے انکار کر دیا۔ان کی بہن کسی طور بھائی کو قائل نہیں کر پا رہی تھیں۔یہاں الفاظ بھی تاثیر سے عاری تھے اور کوئی دلیل بھی کارگر نظر نہیں آتی تھی۔اپنے آپ کو بے بس پا کر بے اختیار اس کے آنسو بہہ نکلے۔جہاں الفاظ اور دلیل بے اثر تھے وہاں آنسوؤں کا تیر نشانے پر جا بیٹھا۔حیدر علی خان بہن سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن اس کے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر گنگ سے ہو کر رہ گئے۔الفاظ ان کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گئے۔انہوں نے سر جھکا لیا اور ہاتھ بڑھا کر اس سے پیسے لے کر اپنی جیب میں ڈال لئے۔

اب گھر کی تکمیل میں حائل واحد رکاوٹ دور ہو چکی تھی۔چنانچہ اگلے چند ماہ میں ہی گھر تیار ہو گیا۔صابرہ خاتون کے ذہن میں گھر کا جو نقشہ تھا، یہ گھر اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔یہ دو منزلہ تھا۔اس میں چار کمرے تھے۔ایک باورچی خانہ اور اینٹوں سے بنا ہوا چھوٹا سا صحن تھا۔ گھر مکمل ہو جانے کے بعد گھر کی آرائش کیلئے پیسے نہیں بچے تھے لیکن صابرہ خاتون کو اس کا کوئی قلق نہ تھا۔وہ اپنا گھر چاہتی تھیں،سو وہ ان کو مل گیا۔

لیاقت بی اے کا سٹوڈنٹ تھا اور شوکت ایف اے کر رہا تھا۔ لیاقت کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔وہ ہر امتحان میں نمایاں پوزیشن لے کر کامیاب ہوتا۔حیدر علی خان کو اس سے بہت امیدیں تھیں۔وہ چاہتے تھے کہ لیاقت ایم اے کرنے کے بعد مقابلے کا امتحان پاس کر لے۔ شوکت نسبتاً کھلنڈرا اور غیر ذمہ دار تھا لیکن گھر میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ سب کا لاڈلا تھا۔

حیدر علی خان کی زندگی میں آرام و آسائش کا کوئی تصور نہ تھا۔کام، کام اور بس کام۔ان تھک محنت کی وجہ سے ان کی صحت گرنے لگی تھی۔ ان کو تھکاوٹ کا احساس رہتا تھا۔لیکن معاشی مجبوری کی وجہ سے وہ اپنی صحت پر توجہ نہیں دے پاتے تھے۔صابرہ خاتون نے کئی دفعہ ان سے کہا کہ وہ شام کو ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر جانا چھوڑ دیں۔لیکن حیدر علی خان جب اس مشورے کے جواب میں صابرہ خاتون سے پوچھتے کہ کیا وہ ریلوے کے محکمہ سے ملنے والی قلیل آمدنی سے گھر کے اخراجات پورے کر لیں گی تو اس بات کا جواب صابرہ خاتون نہیں دے پاتی تھیں اور کسی گہری سوچ میں کھو جاتیں۔

حیدر علی خان کو نئے گھر میں آئے ہوئے آٹھ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ایک دن وہ معمول کے مطابق صبح اپنے دفتر چلے گئے۔وہاں ان کو دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔صابرہ خاتون کو یہ خبر ملی تو وہ سکتہ کے عالم میں آ گئیں۔وہ گھریلو خاتون تیں۔ان کے لئے شوہر کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور محال تھا۔پھر دونوں بچے ابھی اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوئے تھے۔کوئی جائیداد، روپیہ پیسہ بھی پاس نہ تھا جس کی آس پر زندگی بیت جاتی۔بظاہر گزارے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔اپنی خودداری کی وجہ سے وہ کسی کے سامنے ہاتھ بھی نہیں پھیلانا چاہتی تھیں۔

ریلوے کے دفتر میں تعینات منظور صاحب حیدر علی خان کے افسر اعلیٰ تھے۔ان کو جب صورتحال کا پتہ چلا تو انہوں نے خود لیاقت کو محکمہ میں بھرتی کرنے کی پیشکش کی۔لیاقت نے فوراً حامی بھر لی اور اپنی پڑھائی کو خیرباد کہہ کر وہ دفتر جانے لگا۔اضافی آمدنی کیلئے وہ روزانہ شام کو انہی ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر جانے لگا جہاں حیدر علی خان جایا کرتے تھے۔

باپ کی رحلت کے بعد لیاقت کے رویے میں بہت تبدیلی آ گئی

تھی۔ اسے اپنی ذمہ داری کا احساس تھا۔ وہ صابرہ خاتون اور شوکت کا بہت خیال رکھتا۔ خاص طور پر شوکت کی پڑھائی پر بہت توجہ دیتا اور بار بار اسے یقین دہانی کرواتا کہ:

''تمہارا کام صرف پڑھنا ہے۔ جس قدر ہو سکے، دلجمعی سے پڑھ لو۔ گھر کی سب ذمہ داریاں اٹھانا میرا کام ہے اور میں اپنا یہ فرض نبھاتا رہوں گا۔''

شوکت نے بی۔ اے کرنے کے بعد لاء کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ صابرہ خاتون کی خواہش تھی کہ وہ لیاقت کی شادی کے فرض سے فارغ ہو جائیں لیکن جب بھی وہ لیاقت سے اس موضوع پر بات کرتیں تو وہ یہ کہہ کر انکار کر دیتا کہ:

''ماں جی! جب تک شوکت اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو جاتا، میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔''

وقت کا پہیہ چلتا رہا۔ شوکت نے ایل۔ ایل بی کر لیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایک سینئر وکیل منیر صاحب کے ساتھ منسلک ہو گیا اور پریکٹس کرنے لگا۔ جب اسے منیر صاحب سے اپنی پہلی تنخواہ ملی تو وہ خوشی خوشی گھر آیا اور صابرہ خاتون کے پاس آ کر ساری رقم ان کے سامنے رکھ دی۔ صابرہ خاتون کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ کہنے لگیں،

''بیٹا! میری خوشی اس میں ہے کہ تم یہ پیسے اپنے بھا جی لیاقت کے ہاتھ پر رکھ دو۔ مجھ سے بڑھ کر وہ اس کا حقدار ہے۔ تمہارے والد کی وفات کے بعد اس نے تمہیں چھوٹے بھائی کی بجائے اپنا بیٹا سمجھا ہے۔''

شوکت نے پیسے اٹھا کر جیب میں رکھ لئے اور بے چینی سے بھا جی کا انتظار کرنے لگا۔ پچھلے کئی سالوں سے اسے بھا جی دے رہے تھے اور مسلسل دیتے ہی چلے جا رہے تھے۔ اسے ان کی طرف سے باپ جیسی شفقت مل رہی تھی، محبت مل رہی تھی، تحفظ کا احساس مل رہا تھا، اپنائیت کا جذبہ مل رہا تھا۔ وہی اس کی ضروریات کو پورا کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔ وہ خوش تھا کہ اتنے برسوں کے بعد آج وہ بھی اس قابل ہو گیا تھا کہ بھا جی کی نذر کچھ کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بھا جی کے احسان اور ایثار کا بدلہ وہ کبھی بھی نہیں چکا سکتا تھا لیکن وہ بھا جی کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ ان کا مشکور ہے، وہ ان کا ممنون ہے، وہ ان کا احسان مند ہے اور شاید اپنی زندگی کی پہلی کمائی ان کی جھولی میں ڈال کر وہ ان کو اپنے احساسات سے آگاہ کر سکتا تھا۔ رات کو لیاقت جب گھر لوٹا تو شوکت نے پیسے اس کے سامنے رکھ دیئے اور کہنے لگا۔

''بھا جی! اتنے برسوں سے آپ جس ننھے پودے کی آبیاری کر رہے تھے۔ آج اس پودے پر پھل آ گیا ہے۔ بھا جی! یہ میری پہلی تنخواہ ہے۔ اس پر آپ کا حق ہے، صرف آپ کا، مجھے اپنی روزمرہ کی ضروریات کیلئے جتنے پیسوں کی ضرورت ہوگی وہ آپ سے مانگ کر لے لیا کروں گا۔ یعنی میرا خرچہ ابھی بھی آپ کے ذمہ ہوگا۔''

لیاقت نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور پیسے اپنی جیب میں رکھ لئے۔ دونوں بھائیوں کو دیکھ کر صابرہ خاتون کے دل میں خوشی پھوٹنے لگی۔ ان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے سکون اور اطمینان نے ان کے وجود کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہو۔ جیسے وہ بہت ہلکی پھلکی سی ہو کر سمندر کی لہروں پر سوار ہو گئی ہوں اور وہ لہریں ان کو اپنی گود میں لئے جھولے دے رہی ہوں۔ جیسے تاحدِ نظر دیئے جل اٹھے ہوں۔ وہ خوش تھیں کہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے مقام سے واقف تھے۔ وہ دونوں دو ہو کر بھی ایک تھے۔ صابرہ خاتون کے گھر کی اکائی قائم تھی۔

کچھ دن کے بعد شوکت شام کو دفتر سے گھر لوٹا تو خلافِ معمول بھا جی گھر پر تھے۔ گھر کے صحن میں ایک چمکتی دمکتی نئی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ شوکت نے حیرت سے موٹر سائیکل کی طرف دیکھا اور سوالیہ نظروں سے بھا جی کو دیکھا۔ بھا جی نے مسکراتے ہوئے موٹر سائیکل کی چابی شوکت کو دیتے ہوئے کہا،

''حیران کیوں کھڑے ہو۔ بھئی یہ تمہاری موٹر سائیکل ہے اور یہ رہی اس کی چابی۔ اب روزانہ اس پر بیٹھ کر دفتر آیا جایا کرو۔'' یہ سن کر شوکت کی حیرت دوچند ہو گئی۔ کہنے لگا:

''لیکن بھا جی! موٹر سائیکل خریدنے کے لئے پیسے کہاں سے آئے؟''

بھا جی کہنے لگے، ''مجھے احساس تھا کہ اب یہ سواری تمہاری

ضرورت ہے۔اس لئے میں کچھ عرصہ سے ہر ماہ تھوڑی تھوڑی رقم پس انداز کر رہا تھا۔تمہاری تنخواہ کے پیسے اس میں ملا کر میں نے موٹر سائیکل کی پہلی قسط ادا کر دی ہے۔اب ہر ماہ تمہاری تنخواہ سے اس کی قسط ادا کر دیا کریں گے اور گھر کا خرچہ پہلے کی طرح میرے ذمہ ہوگا۔'' شوکت نے چابی بھاجی کو لوٹاتے ہوئے کہا۔

بھاجی! آپ نے تو کمال کر دیا۔لیکن اگر آپ مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں تو نئی موٹر سائیکل آپ لے لیں اور مجھے ابا والی پرانی موٹر سائیکل دے دیں۔'' بھاجی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہ بھئی نہ..... میں اپنی موٹر سائیکل تمہیں دوں گا اور نہ ہی تمہاری موٹر سائیکل میں لوں گا۔اصول کی بات ہے۔اس پر سمجھوتہ نہیں ہوگا۔''

شوکت جانتا تھا کہ اب اصرار کرنا بیکار ہے کیونکہ بھاجی تو مجسم ایثار تھے۔ ہر وقت اپنا سب کچھ شوکت پر قربان کرنے کیلئے تیار رہتے اور ایسا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔شوکت بھاجی کا شکریہ ادا کرنا چاہ رہا تھا لیکن شدتِ جذبات سے اس کی آواز بھر گئی۔اس کی آنکھیں بھر آئیں۔اس کا دل بھی احساسِ تشکر سے لبریز ہو گیا۔وہ سوچ رہا تھا..... کیا چیز ہیں بھاجی۔اس کے گمان سے بہت بلند۔انہوں نے اسے کبھی باپ کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔حیدر علی خان کی وفات کے بعد وہ خود باپ کے سائے سے محروم ہو گئے۔لیکن انہوں نے اسے یتیم ہونے سے بچالیا۔

صابرہ خاتون کی خواہش تھی کہ اب لیاقت کی شادی کر دی جائے۔ جب انہوں نے لیاقت سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے چچازاد بھائی سے اس کی بیٹی شمسہ کا رشتہ مانگ لیا۔شمسہ نے ایف اے پاس کرنے کے بعد گھر کا نظم ونسق سنبھال لیا تھا۔ وہ بہت سلجھی ہوئی متحمل مزاج کی لڑکی تھی۔ صابرہ خاتون نے بہت سادگی سے لیاقت کی شادی کر دی اور شمسہ کو بیاہ کر لے آئیں شمسہ کے آنے سے گھر میں رونق ہو گئی تھی ورنہ روزانہ صبح لیاقت اور شوکت کے جانے کے بعد صابرہ خاتون سارا دن گھر میں تنہا ہوتی تھیں۔وہ چپ چاپ سا خالی خالی گھر جہاں ہر طرف خاموشی راج کرتی تھی، اب شمسہ کے آنے سے چہک اٹھا تھا۔وہ کام کاج میں صابرہ خاتون کا ہاتھ بٹاتی، پہروں ان سے باتیں کرتی، بڑی دلچسپی سے ان کے ماضی کی روداد سنتی۔کبھی کبھار وہ بڑے پیار سے صابرہ خاتون کے کپڑوں پر اعتراض بھی کرتی۔

''ماں جی! اتنے پھیکے اور مدھم رنگ کے کپڑے نہ پہنا کرو۔ انہیں دیکھ کر اداسی کا احساس ہوتا ہے۔اچھا اب میں بازار گئی تو آپ کے لئے اپنی پسند کے کپڑے لاؤں گی۔دیکھنا کیسے بھلے لگیں گے۔''

صابرہ خاتون نے اپنے کپڑوں کی طرف کبھی توجہ نہیں دی تھی اور دونوں بیٹوں نے بھی کبھی یہ بات نوٹ نہیں کی تھی۔اب جب شمسہ یہ کہتی تھی تو وہ دل ہی دل میں اس لئے خوش ہوتی تھیں کہ اس کی ان باتوں سے محبت اور اپنائیت چھلکتی تھی۔لیکن وہ شمسہ کو فوراً منع کر دیتیں،

''نہ بیٹی نہ.....میری بھلا کوئی عمر ہے رنگ برنگے کپڑے پہننے کی۔ابھی میرے پاس بہت کپڑے ہیں۔میرے لئے ہرگز نہ خریدنا۔ ہاں تم اپنے لئے نئے کپڑے بناؤ۔اللہ تمہیں خوشیوں کے ساتھ اوڑھنا پہننا نصیب کرے۔''

شمسہ نے آہستہ آہستہ گھر کا کام سنبھال لیا۔صابرہ خاتون نے بھی بخوشی سب ذمہ داری اس کے حوالے کر دی۔سال کے بعد شمسہ کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔اس کا نام عالیہ رکھا گیا۔عالیہ کی آمد سے گھر کی رونق بہت بڑھ گئی۔سارا دن گھر میں کبھی اس کے رونے کی، کبھی ہنسنے کی اور کبھی کلکاریاں مارنے کی آوازیں آتی رہتیں۔شوکت تو بھتیجی کا دیوانہ تھا۔اسے گود میں لئے پھرتا اور اس کے لئے ڈھیروں کھلونے لاتا۔ صابرہ خاتون بھی اس کے صدقے واری جاتیں اور پہروں اسے گود میں اٹھائے رکھتیں۔

آہستہ آہستہ شوکت کی پریکٹس چل نکلی اور وہ خوب پیسے کمانے لگا۔وہ بھاجی کو بار بار کہتا کہ وہ شام کو ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر جانا چھوڑ دیں کیونکہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔لیکن بھاجی ہر دفعہ اس کے مشورے کو یہ کہہ کر رد کر دیتے تھے کہ:

''جب تک ہمت اور صحت ساتھ دے گی، میں کلینک پر کام کرتا رہوں گا۔ ویسے بھی اتنے برس مسلسل کام کرنے کی وجہ سے اس مصروفیت کی عادت سی ہوگئی ہے۔ اب اس عادت کو کیسے خیر باد کہہ دوں۔''

صابرہ خاتون شوکت کی شادی کر کے اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا چاہتی تھیں جب انہوں نے شوکت سے اس موضوع پر بات کی تو اس نے انہیں بتایا کہ منیر صاحب اسے اپنا فرزند بنانا چاہتے ہیں اور وہ کئی دفعہ دبے لفظوں میں اپنی اس خواہش کا اظہار کر چکے ہیں۔ یہ سن کر صابرہ خاتون کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا وہ ہماری اوقات کو نہیں جانتے؟ کیا وہ اپنی حیثیت کو نہیں جانتے؟ نہ بھئی نہ۔ بھلا ٹاٹ میں مخمل کا پیوند کیونکر لگ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں غلط فہمی ہوگئی ہے۔''

شوکت مسکراتے ہوئے کہنے لگا،

''ماں جی! وہ سب جانتے ہیں۔ لاعلم تو آپ خود ہیں۔ آپ کا برخوردار تو ہیرا ہے ہیرا۔ وہ جہاندیدہ آدمی ہیں۔ وہ میرے آج کو نہیں دیکھ رہے۔ ان کی نظریں میرے کل پر ہیں۔''

صابرہ خاتون کا دل اس بات کو نہیں مان رہا تھا۔ انہوں نے بڑے پیار سے شوکت کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! میں اس رشتہ کے حق میں نہیں۔ اتنی اونچی اڑان بھرنے کی کوشش نہ کرو جو تمہیں بے دم کر دے۔ ایسے خواب مت دیکھو جن کی تعبیر پانا ہمارے لئے ممکن نہ ہو۔ اپنے برابر کے لوگوں سے رشتہ داری قائم ہو جائے تو وہ دیرپا اور گہری ہوتی ہے اور فریقین کیلئے سکون، محبت اور قوت کا باعث بن جاتی ہے۔'' شوکت کہنے لگا۔

''ماں ی جی! میں نے ہمیشہ آپ کے اور بھا جی کے حکم پر سرِ تسلیم خم کیا ہے لیکن اس دفعہ آپ میری بات مان لیں۔ میری اچھی اماں! میں زندگی میں بہت آگے جانا چاہتا ہوں لیکن سرِ دست اتنی بلندی پر باآسانی خود بخود پہنچ جانا میرے بس میں نہیں۔ اس کے لئے مجھے زینہ درکار ہے۔ اب جبکہ یہ زینہ اپنے آپ ہی میرے قدموں تلے آ رہا ہے تو مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھانے دیں۔ جب ان کو کوئی اعتراض نہیں تو پھر آپ کو کاہے کی فکر ہے۔''

اگرچہ زندگی میں آگے بڑھنے کی خواہش انسانی فطرت میں موجود ہے لیکن لیاقت کی نظر چونکہ ہمہ وقت اپنی ذمہ داریوں پر ٹکی رہتی تھی اس لئے اسے اپنے گردوپیش زندگی کی آسائشیں متوجہ نہیں کرتی تھیں اور نہ ہی وہ انہیں حاصل کرنے کی دوڑ میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ البتہ شوکت کے ارادے بلند تھے۔ وہ زندگی میں ممتاز مقام پانے کا متمنی تھا اور اس کے لئے روپے پیسے کی فراوانی اولین اہمیت کی حامل تھی۔ شوکت کی باتیں صابرہ خاتون کو مطمئن تو نہ کر سکیں لیکن وہ خاموش ہو گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ لیاقت اس بارے میں باآسانی شوکت کو قائل کر لے گا۔ یہی سوچ کر انہوں نے لیاقت سے اس بات کا تذکرہ کیا تو خلاف توقع وہ کہنے لگا، ''ماں جی! زندگی تو شوکت نے بسر کرنی ہے۔ اگر یہ اس کی خواہش ہے تو بسم اللہ کیجئے۔''

صابرہ خاتون نے اس رشتہ کو تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیا اور یوں غزالہ ان کے گھر میں رونق افروز ہوگئی۔ شمسہ نے کھلے دل سے غزالہ کو خوش آمدید کہا لیکن اس سادہ اور مختصر سے گھر کو دیکھ کر غزالہ کے دل میں اپنی بڑائی اور امارت کا احساس جاگ اٹھا۔ اسے اہل خانہ کی بد ذوقی پر بھی افسوس ہونے لگا۔ اس نے سوچا کہ اگر صحن میں دو چار پودوں کے گملے لا کر رکھ دیئے جائیں، برتنوں کی الماری کے پرانے گدلے سے شیشے بدل دیئے جائیں اور پھر اس میں چند نئے برتنوں کا اضافہ کر کے انہیں نئی ترتیب دے دی جائے اور قالین کا ایک چھوٹا ٹکڑا راہداری میں بچھا دیا جائے تو گھر کا نقشہ بدل جائے گا۔ اس انقلاب کے لئے عقل اور سلیقہ کی ضرورت تھی جو شمسہ کے پاس نہیں تھا۔ شمسہ تو لکیر کی فقیر تھی۔ صابرہ خاتون نے اس گھر کو جس انداز میں رکھا تھا اس نے بے چون وچرا اسی کو اپنا لیا تھا۔

غزالہ نے شوکت کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا تو وہ خوش ہوگیا۔ چنانچہ غزالہ نے گھر کی چیزوں کی ترتیب کو بدلنا شروع کر دیا۔ کچھ پرانے ناکارہ سامان کو کوڑا کرکٹ سمجھ کر پھینک دیا اور کچھ نئی چیزوں کا اضافہ کر دیا۔ شمسہ کو ان چیزوں کی موجودگی اور ترتیب پر پہلے اعتراض تھا نہ اب ہوا۔ البتہ صابرہ خاتون کو دل ہی دل میں یہ تبدیلی اچھی نہ لگی۔ جس

پرانے سامان کو پھینکا گیا تھا، ان کی زندگی کی کئی یادیں اس کے ساتھ وابستہ تھیں۔ کئی چیزیں جو غزالہ کی نظر میں بیکار تھیں، وہ صابرہ خاتون کے بڑھاپے اور کمزوری میں ان کیلئے سہولت کا باعث تھیں۔

اس تبدیلی کے ساتھ ہی انہیں اپنے گھر میں اجنبیت کا احساس ہونے لگا تھا۔ جیسے کسی نے ان سے ان کی سلطنت چھین لی ہو، جیسے ان کی ریاست میں ان کی عملداری کا خاتمہ ہو گیا ہو، جیسے ان کے نظم و نسق کو فرسودہ قرار دے کر نئے قوانین لاگو کئے جا رہے ہوں، جیسے ان کی گھر داری کے نقائص کو سرِ عام اچھالا جا رہا ہو۔ لیکن وہ اس لئے خاموش تھیں کہ اگر ان کے لب کھل جاتے تو اس گھر کی بنیادیں ہل جاتیں اور یہ تباہی انہیں کسی صورت گوارا نہیں تھی۔ گھر کی اکائی اور امن برقرار رکھنے کیلئے وہ بخوشی صبر کے کڑوے گھونٹ پی سکتی تھیں۔

لیاقت صبح سویرے گھر سے نکل جاتا اور رات کو تھکا ہارا واپس آتا تھا اس لئے اس نے شاید کسی تبدیلی کو نوٹ ہی نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی اس کا بیڈ روم جوں کا توں تھا اس لئے اسے بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ البتہ شوکت غزالہ کے سلیقہ اور اعلیٰ ذوق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے اپنی خوش بختی پر فخر محسوس ہونے لگا۔ غزالہ کو گھر کی سجاوٹ سے فراغت ملی تو اسے شمسہ کے پکائے ہوئے کھانے پر اعتراض ہونے لگا۔ اس نے شمسہ کو بارہا اپنے میکہ کے گھر کی مثالیں دے دے کر سمجھایا لیکن وہ رہی کوڑھ مغز کی کوڑھ مغز۔ اس کی روٹین میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ روزانہ صبح اٹھ کر سب کو ناشتہ کروا کے صابرہ خاتون سے مشورہ کر کے ہنڈیا چولھے پر چڑھا دیتی اور گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔ کبھی کبھار صابرہ خاتون شمسہ کو مشورہ دیتیں کہ:

''آپ کام کاج کیلئے غزالہ کی مدد بھی لے لیا کرو۔''

لیکن شمسہ اس کے جواب میں کہتی تھی کہ:

''اس سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔ غزالہ کے آنے سے پہلے بھی میں یہ ذمہ داریاں نبھا رہی تھی، سو اب بھی ویسے ہی کر رہی ہوں۔ بہت زندگی پڑی ہے کام کرنے کیلئے آہستہ آہستہ وہ خود ہی گھر داری کی طرف مائل ہو جائے گی۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔'' شمسہ نے اپنی عادات، صبر و تحمل اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے صابرہ خاتون کے دل میں اپنے لئے خاص جگہ بنا لی تھی۔ وہ اس پر بہت اعتماد کرتیں، اس سے مشورہ کرتیں اور اس کی رائے کو بہت اہمیت دیتیں۔ غزالہ کو ان کا یہ رویہ بہت کھلتا تھا۔ وہ شوکت سے کہتی تھی کہ جب اس کی اور شمسہ کی حیثیت اس گھر میں یکساں ہے تو پھر کیا شمسہ کو سرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ ہر معاملہ میں اسے فوقیت دی جاتی ہے۔ غزالہ کے توجہ دلانے پر شوکت بھی اس فرق کو محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن ماں اور بھاجی کے احترام کی وجہ سے وہ چپ تھا۔ البتہ وہ گاہے گاہے غزالہ کو اس کے حوصلے اور برداشت کی داد ضرور دیتا۔

غزالہ کی شادی کو ایک سال کا عرصہ گزرا تھا کہ اس کی گود ننھے منے، گول مٹول سے بیٹے سے بھر گئی۔ بچے کا نام ذیشان رکھا گیا۔ ذیشان چھ ماہ کا تھا کہ شمسہ کے ہاں بھی بیٹے نے جنم لیا۔ شمسہ کا بیٹا ذیشان کے برعکس جسمانی طور پر دبلا پتلا اور کمزور تھا۔ اس کا نام سعد رکھا گیا۔ صابرہ خاتون کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ بچوں کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی تھیں۔ سعد ابھی ایک ماہ کا تھا کہ اسے بخار نے آلیا۔ شمسہ اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ڈاکٹر نے بچے کا معائنہ کیا اور اسے بتایا کہ بخار کا آنا تو معمولی سی بات ہے البتہ اس بچے کو آنکھوں کے کسی ماہر ڈاکٹر کے پاس ضرور لے کر جانا چاہیے کیونکہ اس کی آنکھوں میں شاید کچھ نقص ہے۔ شمسہ اور لیاقت اسے لے کر ماہر امراض چشم کے پاس چلے گئے۔

ڈاکٹر نے سعد کی آنکھوں کا تفصیلی معائنہ کیا اور انہیں بتایا کہ سعد پیدائشی نابینا ہے اور یہ نقص لاعلاج ہے۔ شمسہ کو یوں محسوس ہوا گویا کسی نے اس کے کانوں میں بم پھاڑ دیا ہو، جیسے اس کے وجود کے پرخچے اڑ گئے ہوں، جیسے کسی نے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہو۔ جیسے کسی نے اس کے دل پر پتھر کی سِل رکھی دی ہو۔ اس کا بس نہیں چلتا کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں نوچ کر انہیں سعد کے چہرے کی زینت بنا دے اور خود ہمیشہ کیلئے اتھاہ تاریکیوں میں اتر جائے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو وہ بلا توقف بخوشی یہ کر گزرتی لیکن وہ کتنی بے بس تھی کہ اس کی مامتا، اس کی محبت اور اس کی خواہش سعد کے کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔

لیاقت نے جب یہ خبر سنی تو اس کی نظروں کے سامنے ہر چیز

گھومنے لگی۔ کمرے کی چھت زمین بوس ہو رہی تھی اور زمین چھت کی طرف لپک رہی تھی۔ کمرے کی دیواریں گول گول دائروں میں گھوم رہی تھیں۔ پھر یہ گردش تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ لیاقت کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا۔ کچھ دیر بعد لیاقت کو ہوش آیا تو وہ شکستہ سے سعد کو لے کر گھر واپس لوٹے۔ صابرہ خاتون برآمدے میں بچھے ہوئے تخت پر بیٹھی ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ دونوں کی اڑی اڑی سی رنگت، بھنچے ہوئے ہونٹ اور بھیگی آنکھیں دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ اپنا سب کچھ لٹا کر واپس آئے ہیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر سعد کو گود میں لے لیا اور اس کی خیریت دریافت کی۔ صابرہ خاتون کا پوچھنا تھا کہ شمسہ کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور اس نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ صابرہ خاتون کو جب لیاقت کی زبانی اس تلخ حقیقت کا پتہ چلا تو ان کی گویا کمر ٹوٹ گئی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ حیدر علی خان کی جدائی سے بڑھ کر ان کے لئے کوئی غم ہو ہی نہیں سکتا لیکن اب انہیں احساس ہوا کہ اس اذیت کے سامنے اُس غم کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

پورے گھر کی فضا بوجھل ہو گئی تھی۔ صابرہ خاتون چپکے چپکے آہیں بھرتی تھیں۔ شمسہ کے آنسو تھمنے میں نہیں آتے تھے اور لیاقت کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ بس کبھی کبھار غزالہ کی محبت بھری آواز گونج اٹھتی تھی جب وہ ذیشان سے مخاطب ہو کر کہتی تھی کہ۔

''میرا راجہ بیٹا ایک دن بہت بڑا آدمی بنے گا۔ میرا ذیشان تو واقعی ذیشان ہو گا۔''

غزالہ کی یہ آواز شمسہ کو پریشان کر دیتی اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتی اس کے دل میں یکے بعد دیگرے کئی سوال ابھر آتے تھے۔ وہ سعد کو دیکھتی چلی جاتی اور اپنے آپ سے پوچھتی۔

''سعد بڑا ہو کر کیا بنے گا؟ سعد بڑا ہو کر کیا کرے گا؟''

اس کے ساتھ ہی اس کا ذہن شل ہو جاتا اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔

ذیشان تین سال کا ہوا تو غزالہ نے اسے اسکول داخل کروا دیا۔ روزانہ صبح جب ذیشان یونیفارم پہن کر اسکول کیلئے رخصت ہو جاتا تو شمسہ کے دل میں ہوک اٹھتی تھی کہ کاش وہ سعد کو بھی اسی طرح تیار کر کے اسکول بھیج سکتی۔ غزالہ گاہے گاہے شمسہ کو مشورہ دیتی کہ ''سعد کو محلے کی مسجد کے امام صاحب کے پاس قرآن حفظ کرنے کیلئے بھیج دو۔ کیونکہ بینائی نہ ہونے کی وجہ سے اسکول میں پڑھنا سعد کے بس کی بات نہیں۔ اور اگر پڑھ نہیں سکے گا تو کمائے گا کیسے اور کمائے گا نہیں تو کھائے گا کیا؟ قرآن حفظ کر کے کسی مسجد کا امام بن جائے گا۔ اس طرح وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا اور محتاجی سے بچ جائے گا۔

اس کے بعد غزالہ کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتی:

''ہائے اللہ ایسی محتاجی سے سب کو محفوظ رکھے۔ اس محرومی سے دشمن کو بھی بچائے پتہ نہیں بے چارا پہاڑ سی زندگی کیسے کاٹے گا۔''

غزالہ کی یہ باتیں تیر بن کر شمسہ کے جگر کے آر پار ہو جاتی تھیں لیکن وہ جواب نہیں دے پاتی تھی۔ اس کے پاس کہنے کو تھا بھی کیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ شوکت کی وکالت کی دھاک بیٹھ گئی۔ بڑی بڑی کمپنیوں کے مالکان اپنے کیس لے کر اس کے پاس آتے اور وہ ان سے منہ مانگی فیس وصول کرتا جوں جوں آمدنی بڑھتی چلی گئی، شوکت کے دل میں مزید دولت حاصل کرنے کی کبھی ختم نہ ہونے والی خواہش پروان چڑھنے لگی۔ اس کی کسوٹی، اس کا معیار اور اس کا مقصد صرف ہر قیمت پر بے شمار دولت حاصل کرنا ہو کر رہ گیا۔ اب اسے اس مختصر سے گھر میں گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ پھر غزالہ بھی اسے سمجھاتی تھی کہ:

''جب خدا نے ہمیں اس قابل کر دیا ہے کہ ہم ایک عالیشان گھر لے کر آرام دہ زندگی بسر کر سکتے ہیں تو پھر بھلا کیوں اپنے آپ کو تکلیف میں مبتلا کئے رکھیں۔ یہ تو سراسر حماقت ہے، یہ تو ناشکری ہے، یہ تو کفران نعمت ہے۔''

غزالہ کی ان باتوں نے شوکت کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ وہ تو ویسے بھی غزالہ کا ممنون تھا کہ اتنے بڑے گھر کی لڑکی ہونے کے باوجود اس نے چھوٹے اور معمولی سے گھر میں گزارا کیا تھا۔ غزالہ کے میکہ والے ہر لحاظ سے اس کے اپنے گھر والوں سے بہتر تھے۔ اس کے باوجود اس نے اپنے معیار سے کمتر سسرال والوں کے ساتھ رہنا گوارا کیا۔ شوکت اب غزالہ کو اس کے ان احسانات کا بدلہ ایک الگ اور خوبصورت

گھر کی شکل میں چکانا چاہتا تھا۔لیکن شوکت کیلئے مشکل یہ تھی کہ وہ اپنی اس خواہش کا اظہار بھا جی سے نہیں کرسکتا تھا کیونکہ بھا جی اس کے لئے بھائی نہیں بلکہ باپ کی جگہ پر تھے۔وہ ان کو کس منہ سے کہتا کہ وہ ان سے الگ ہونا چاہتا ہے۔شوکت نے غزالہ کو اپنی اس مشکل سے آگاہ کیا اور اس سے مشورہ طلب کیا تو وہ چمک کر بولی،

''بھا جی کو باپ کہہ کر اپنے مرحوم باپ کی توہین کیوں کرتے ہو؟ باپ تو بس ایک ہی ہوتا ہے۔تمہارے کہنے یا سمجھنے سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ ہر چیز اپنی جگہ پر بھلی معلوم ہوتی ہے اور ہر چیز کا حق بھی یہی ہے کہ اسے اس کی صحیح جگہ پر رکھا جائے۔باپ کو باپ کی جگہ دو اور بھا جی کو بھائی کی جگہ۔ مانتی ہوں کہ بھا جی کے بڑے احسان ہیں تم پر لیکن یہ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں۔ ذرا سوچو کہ بھا جی کی بجائے اگر تم عمر میں ان سے بڑے ہوتے تو کیا ایسے حالات میں تم ان کے لئے وہی کچھ نہ کرتے، جو انہوں نے تمہارے لئے کیا۔اپنے بہن بھائی ہی مشکل وقت میں ایک دوسرے کی بانہہ پکڑتے ہیں۔اس میں ایسی کونسی غیر معمولی بات ہے۔ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے ذہن پر سوار نہ کرلیا کرو۔''

غزالہ کی باتیں سن کر شوکت کو خیال آیا کہ واقعی اس نے کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا وہ تو بچپن سے اپنے سر پر بھا جی کے احسانات کی گٹھڑی لادے ہوا تھا۔آج غزالہ نے اس کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ وہ اس بات کا قائل ہوگیا کہ آج تک بھا جی نے جو کچھ کیا، وہ ان کا فرض تھا۔ اگر وہ عمر میں ان سے بڑا ہوتا تو وہ یہی ذمہ داریاں اسی انداز میں نبھاتا۔ غزالہ کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی پا کر بالآخر اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ پہلے صابرہ خاتون کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرے گا اور بعد ازاں کسی مناسب موقع پر بھا جی کو بھی بتادے گا۔

غزالہ ذیشان کو لے کر اپنے میکہ گئی ہوئی تھی۔صابرہ خاتون تخت پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھی کہ شوکت ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ پہلے ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر انہیں بتایا کہ وہ اپنے لئے ایک بڑا اور آرام دہ گھر خریدنا چاہتا ہے تاکہ وہ غزالہ اور ذیشان کو لے کر وہاں شفٹ کر جائے۔ اگر وہ چاہیں تو وہ بھی اس کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔شوکت کی بات سن کر صابرہ خاتون بھونچکی ہو کر رہ گئیں۔ان کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اگر شوکت ان کو یہ کہتا کہ ہم سب نئے گھر میں مل جل کر رہیں تو شاید وہ بخوشی آمادہ ہو جاتیں لیکن وہ تو الگ ہونا چاہ رہا تھا۔

شوکت کا تعلق دن بدن روپے پیسے سے مضبوط ہوتا جا رہا تھا اور پرانے تعلق، رشتے ناطے کمزور پڑتے جا رہے تھے۔انہوں نے بڑی نرمی اور محبت سے شوکت کو لیاقت کے احسانات یاد کروائے اور اسے سمجھایا کہ ''بہتر یہی ہے کہ جہاں رہو، اکٹھے رہو۔ کیونکہ لیاقت نے تمہارے لئے بھائی کا نہیں بلکہ باپ کا کردار ادا کیا ہے۔'' کچھ دیر تو شوکت ان کی باتیں سنتا رہا، پھر بول اٹھا۔

''آپ کی اسی تلقین کی وجہ سے میرے ذہن میں کھچڑی سی پک کر رہ گئی ہے۔ باپ کو یاد کرنا چاہتا ہوں تو بھا جی سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب بھا جی سے بات کر رہا ہوتا ہوں تو ان کا چہرہ پس منظر میں چلا جاتا ہے اور ان کی گردن پر ابا کا چہرہ ٹک جاتا ہے۔آپ نے مجھ سے میرے باپ کی یاد بھی چھین لی اور میرا بڑا بھائی بھی۔ بھلا باپ کی جگہ بھی کوئی لے سکتا ہے؟''۔

یہ کہہ کر وہ اٹھا، کار کی چابی لی اور گھر سے باہر نکل گیا۔

صابرہ خاتون گم صم خلاؤں میں گھورنے لگیں۔انہیں شوکت سے یہ امید نہ تھی لیکن وہ جان گئی تھیں کہ یہ ان ہونی اب ہو کر رہے گی۔اب بھائی بھائی سے جدا ہوگا اور اس گھر کا شیرازہ بکھر کر رہے گا۔انہیں دُکھ اس بات کا تھا کہ اس سے پہلے شوکت نے کبھی ان کے ساتھ اس تیکھے انداز سے گفتگو نہیں کی تھی۔آج اس کے لہجے میں احترام اور محبت نہیں تھی، اس کے روپ میں نیاز مندی نہیں تھی اور اس کے الفاظ تیر کی سی چبھن لئے ہوئے تھے۔

دراصل جب تک شوکت کے دل میں بھا جی کے احسانات کا احساس رہا، اس کی زبان بھی سنبھلی رہی لیکن اس احساس کے مٹتے ہی وہی زبان اب موقعے کی تاک میں رہنے لگی۔ ویسے بھی اگر زبان اپنی حد کو پھلانگتے ہوئے رواں ہو جائے تو پھر اس کا سمٹ جانا مشکل ہو جاتا ہے، جیسے الاسٹک میں لچک ختم ہو جائے تو وہ لٹک کر پھیل جاتی ہے۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر شگفتہ نقوی

مٹّی کے باوے

ڈاکٹر وردہ آؤٹ ڈور میں تھیں جب تیسری دفعہ پیغام آیا کہ کانفرنس روم میں ایک ٹی پارٹی ہے سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ جو مریضہ کھڑی تھی اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ واپسی کب ہوگی۔

ڈاکٹر وردہ نے اسے تسلی دی کہ ''بس ایک گھنٹہ..... انتظار کر سکتی ہو'' وہ بولی نہ جی..... سرکاری ہسپتالوں میں یہی حال ہوتا ہے کسی کی جان پہ بنی ہوانہیں کیا۔ ان کو اپنی پارٹیاں عزیز ہیں۔ یہ معالج ہیں۔ مسلمان معالج.....''

وار کاری تھا۔ کام کر گیا۔ وردہ بولی ''پتہ نہیں لوگ ہم سے اتنے بدگمان کیوں ہیں۔ ہم بھی انسان ہیں۔'' اس نے تھیٹر بوائے طارق سے کہا۔ ''پلیز میری چائے یہاں دے جاؤ۔ میں بعد میں سوری کر لوں گی۔ میڈم سے کہنا مریض بہت زیادہ ہیں۔''

''جی آپ انسان ہیں۔ ہم تو مٹی کے باوے ہیں اور آپ کے رحم وکرم پر.....''

وردہ کا موڈ سخت آف تھا۔ لیکن اسے ابو کی بات یاد آئی..... ''بیٹی مریض تکلیف میں ہوتا ہے اس منہ سے بری اور دل دکھانے والی بات بھی نکل جائے تو تمہیں صبر ہی کرنا ہے۔ کیونکہ وہ اور تم ایک لیول پر نہیں ہو۔''

یہ جملہ اس کی ڈھال تھی ہر مشکل میں کام آتا اور فتنہ گر لمحہ ٹال جاتا۔

''آپ کا نام.....'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''فرحت عبداللہ..... عمر 42 سال''

''اچھا..... آپ تو بہت کم عمر لگتی ہیں۔''

''کیا تکلیف ہے.....؟'' وہ ساتھ ہسٹری لکھ رہی تھی اور روٹین ٹیسٹ بھی.....

''جب چلتی ہوں خاص طور پر سیڑھیاں یا چڑھائی تو میرا گھٹنا درد کرتا ہے''

''آپ کے گھر میں سیڑھیاں ہیں؟'' اس نے خود کلامی کی۔

''جب لکھنے لگتی ہوں تو کلائی میں درد ہوتی ہے۔''

''آپ ٹیچر ہیں.....؟''

''جی ہاں..... جب برتن دھوتی ہوں تو انگلیوں میں درد ہوتا ہے۔ چلتی ہوں تو کمر دکھتی ہے۔ لیٹتی ہوں تو گردن میں اکڑاؤ آ جاتا ہے۔ جب کپڑے دھوتی ہوں تو بخار ہو جاتا ہے۔ ٹی وی دیکھوں تو سر میں درد ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر وردہ نے اچانک لکھنا بند کر دیا اور اس کی طرف دیکھنے لگی اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہو لیکن وہ چپ رہی اور قلم رکھ دیا۔

فرحت بولی۔ ''ابھی تو میں نے آدھی تکلیفیں بتائی ہیں۔ آپ کی بس ہوگئی باقی کون لکھے گا۔''

اسے آج تک کسی ایسے مریض سے پالا نہ پڑا تھا۔ اس کو تو سائیکاٹری آؤٹ ڈور میں بھیجنا چاہیے۔ ہائے بیچارے ڈاکٹر احسن..... ایسے مریضوں کو کیسے ڈیل کرتے ہونگے۔ میرے دماغ کا تو فیوز اڑ گیا ہے۔ فرحت بول رہی تھی۔

''رات کو چھ سے دس دفعہ پیشاب کیلئے اٹھتی ہوں، نیند ویسے ہی نہیں آتی۔ بھوک بھی نہیں لگتی۔ کچھ کھالوں تو پیٹ میں درد۔ کبھی کبھی دل بھی خراب ہوتا ہے۔ سستی بہت ہے۔ نماز نہیں پڑھی جاتی۔ سوچ کے رہ

جاتی ہوں۔''

''جاب پر کیسے جاتی ہیں؟''

''مجبوری ہے۔تنخواہ نہ ملے تو علاج کہاں سے کرواؤں۔''

زبان تھی یا دودھاری تلوار.....کہ بس کاٹ کے رکھ دے اب اس کا پیمانہ صبر لبریز ہونے کو تھا کہ طارق چائے اور سموسے بسکٹ لے آیا۔ اس نے فرحت سے کہا آپ چائے لے لیں اور طارق سے کہا کہ ایک کپ اور لے آؤ۔

فرحت نے حیران ہو کر اسے دیکھا''نہیں نہیں آپ پئیں۔''

''اچھا یہ سموسہ تو لے لیں۔میری چائے ابھی آجاتی ہے۔''

اب اس کا لہجہ قدرے دھیما پڑ گیا تھا۔

اس نے ڈاکٹر احسن کو فون ملایا۔''کہ ایک مریض بھیج رہی ہوں۔آپ فارغ ہیں۔''

''آؤٹ ڈور میں فراغت کہاں .....اگر آپ سمجھتی ہیں کہ کوئی مینٹل پرابلم ہے تو بھیج دیں۔''

''جی اچھا۔''

طارق چائے لے کر آیا تو اس نے کہا''طارق یہ فرحت ہے ان کو ڈاکٹر احسن کے آؤٹ ڈور میں چھوڑ آؤ۔''

اس نے اطمینان کا سانس لیا۔چائے پی اور جلدی جلدی باقی مریض دیکھے جس دن اس کا آؤٹ ڈور ہوتا۔بچوں کو وہ سکول سے لیتی تھی۔لیکن آج بہت رش تھا۔اس نے اپنے شوہر ڈاکٹر ساجد کو فون کیا۔ میں بچوں کو لینے نہیں جا سکوں گی رش زیادہ ہے آپ لے آئیں۔اچھا ٹھیک ہے اور فون بند ہو گیا۔اب اسے تسلی ہو گئی۔وہ آخری مریض دیکھ رہی تھی کہ ڈاکٹر احسن کا فون آ گیا۔''جی سر''''وہ تو بالکل نارمل ہے۔اس کا گائنی کا پرابلم ہے میں نے اس کو گائنی آؤٹ ڈور میں ریفر کر دیا ہے۔''

گائنی میں اس کی کلاس فیلو ثمینہ تھی اس نے کہا ایک مریض ہے فرحت.....اسے اچھی طرح دیکھنا اور مجھے بتانا۔تھوڑی دیر بعد ثمینہ کا فون آیا کہ میں نے اس کو ای این ٹی میں بھجوا دیا ہے۔گائنی کا مسئلہ نہیں ہے۔انہوں نے کہا وقت ختم ہو گیا ہے۔کل اتوار ہے پرسوں آنا۔

جب یہ اطلاع وردہ کو ملی.....تو وہ چکرا کر رہ گئی۔یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔اس نے مائی سے کہا کہ ای این ٹی کے آؤٹ ڈور میں ایک مریضہ ہے فرحت عبداللہ.....جلدی سے بھاگ کر جاؤ۔اور اسے بلا لاؤ۔مائی نے آ کر کہا کہ آؤٹ ڈور تو کب کا بند ہو گیا ہے۔ہم ہی بیٹھے ہیں وہاں تو کوئی مریض نہیں ہے۔

وہ فارغ ہو کر گھر تو آ گئی لیکن اس کے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی کہ آخر اسے کیا تکلیف ہے۔رات کو کھانے کی میز پر اس نے ساری داستان ڈاکٹر ساجد کو سنائی وہ ذرا بھی حیران نہ ہوئے، کہنے لگے۔''اس کو ہسٹریا ہے۔''

''لیکن اسے دورے (Fits) نہیں پڑتے۔''

''ضروری تو نہیں..... یہ فٹس کے ساتھ نہیں ہے۔اصل مطلب یہ ہے کہ پس پردہ کوئی اور وجوہات ہوتی ہیں اور مریض اُن پر سے پردہ اٹھانا نہیں چاہتا۔کبھی رسوائی کے ڈر سے.....کبھی یہ اس کی بات نہ مانی جائیگی وہ معالج کو اِدھر اُدھر کی سیر کراتا رہتا ہے۔''

''آپ نے کتنی جلدی اس کو تشخیص کر لیا۔میں تو پریشان ہو گئی تھی۔لیکن آج تو ہم نے اُسے سارے آؤٹ ڈورز کی سیر کرا دی ویسے اس کی زبان تھی یا تیز تلوار.....توبہ توبہ.....تو پھر اس کا علاج کیا ہے؟''

''کوئی Anxiolytic دیدو..... چھ ہفتے کیلئے۔''

''اس سے کونسا مسئلہ حل ہو جائے گا جب کہ ہمیں پتہ ہی نہیں اس کا مسئلہ کیا ہے؟''

''تو پھر تلاش کرو۔''

''اب پتہ نہیں وہ دوبارہ آئے گی یا نہیں.....''

''باہر رجسٹر میں اس کا پتہ فون نمبر سب لکھا ہوتا ہے تم فون کر کے خود بلوا لینا.....''

''کیوں.....مجھے کیا ضرورت ہے.....؟''

''جب ایف ایس سی میں ٹاپ کیا تھا تو اخباری نمائندوں سے کہا تھا نا کہ میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہوں تو اب کرو نا خدمت۔''

''وہ تو کہیں سے بھی دکھی نہیں لگتی تھی۔'' وہ بولی۔

''تو پھر اسے ہسپتال آنے کی کیا ضرورت ہے۔ اچھا آج ہم فرحت عبداللہ کے علاوہ کوئی اور بات نہیں کر سکتے۔''

''توبہ ہے میاں بیوی کے ڈاکٹر ہونے کا یہی تو فائدہ ہے کہ ڈسکس کرنے سے کئی مسائل کا حل مل جاتا ہے۔ باہم مشورہ کر سکتے ہیں۔''

''آؤٹ ڈور چلانا تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔'' ساجد نے کہا۔

''تو ایسے مریض روز روز تھوڑی آتے ہیں۔ مجھے کریدلگ گئی ہے کہ اسے کیا بیماری ہے.....''

''ہوسکتا ہے کوئی ''میک اے وش'' (Make a wish) جیسی بیماری ہو آج کل فیشن ہے نا ایک این جی او بنی ہے وہ مرنے والے سے اس کی آخری خواہش پوچھتے ہیں اور پھر پوری کر دیتے ہیں۔''

''توبہ ہے آپ سے.....کہاں کی خبر کہاں لگا دیتے ہیں۔''

''سچی اُن کے پاس بھجوا دو فرحت عبداللہ کو.....یہی اس کا علاج ہے۔''

''مگر وہ کوئی مرنے والی تو نہیں ہے۔''

''ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ وش پوری ہو جانے کے بعد اسے مرنا پڑے گا۔''

وردہ جھلا کر میز سے اٹھ گئی۔ ساجد نے ٹی وی لگا لیا۔ ایک ہفتہ گزر گیا بات آئی گئی ہوگی۔ وردہ بھی بھول گئی۔ ایک دن ڈاکٹر ساجد نے اپنی بیگم کو بتایا کہ فرحت عبداللہ آج سرجیکل آؤٹ ڈور میں میرے پاس آئی تھی۔ وہ اس خبر پر چونک گئی۔

''اچھا.....پھر.....آپ نے مجھے نہیں بتایا وہاں کیا کرنے آئی تھی۔''

''بتا تو رہا ہوں۔ اسے میں نے تمہاری طرف ریفر کر دیا ہے۔''

''وہ کس لئے.....؟'' اس کا انداز سوالیہ تھا۔

''کیوں کہ زمین گول ہے وہ جہاں سے چلی تھی وہاں آجائے گی۔''

''مذاق نہ کریں.....میں اس کا کیا کروں گی۔''

''اس کا مسئلہ تلاش کرو۔ مجھے بتاؤ مل کر اس کا علاج کریں گے''۔

''تو آپ نے کیوں نہیں کیا۔ میں کوئی شرلک ہومز ہوں۔''

''تو اب بن جاؤ.....تمہیں اس کی فکر ہو رہی تھی تم کو پتہ نہیں اللہ پاک فرماتے ہیں جس نے ایک شخص کی جان بچائی گویا اس نے تمام انسانیت کو بچایا۔''

''ساجد آپ کو ہر موقع ہر بات کیسے یاد رہتی ہے''۔ وہ حیرت سے بولی۔

''بس جب تم ساتھ ہوتی ہو تو میرا دماغ خوب چلتا ہے۔''

''اب میری خوشامد نہ کریں۔''

''بیوی کی تعریف میں تھوڑا جھوٹ بولنا بھی جائز ہے۔'' ساجد مسکرایا۔

''نہ جی ہمیں جھوٹی تعریف نہیں چاہیے۔ نا منظور! اپنے پاس رکھیں۔''

دوسرے دن آؤٹ ڈور میں فرحت عبداللہ پھر موجود تھی۔ اسے سمجھ نہ آئی کہ وہ اس کا استقبال کیسے کرے۔ خوشی سے، بیزاری سے، یا غیر جانبداری سے۔ لیکن وہ ہلکا سا مسکرا دی اور اس سے ہاتھ بھی ملا لیا۔

''آؤ فرحت کیسی ہو۔''

''آپ نے تو مجھے سر سے ٹالا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے میرا علاج آپ کے پاس ہے۔''

''آپ کافی دنوں بعد آئی ہیں۔'' اس نے رسان سے کہا۔

''ہاں روز روز سکول سے چھٹی نہیں ملتی۔ آج بھی اپنی بہن میمونہ کو اپنی کلاس دے کر آئی ہوں۔ لگتا ہے کسی دن میری چھٹی ہو جائے گی۔''

اب وردہ دل میں سوچ رہی ہے کہ کیا سوال کروں۔ کیسے کروں۔ تکلیف کا پوچھا تو یہ پہلے کی طرح شروع ہو جائے گی۔

''پرانی پرچی آپ کے پاس ہے.....؟'' اس نے فرحت سے نظریں نہ ملائیں اس نے اس کی لکھی ہوئی پرچی جو کافی میلی ہو چکی تھی

پیش کردی۔

''یہ تو وہی ہے باقی پرچیاں کدھر ہیں۔ جو اتنے ڈاکٹروں نے دیکھا ہے میں بھی تو دیکھوں کیا لکھا ہے.....؟''

''انہوں نے تو زبانی بات کی تھی لکھا تو کچھ بھی نہیں۔ بس اتنا کہا کہ آپ غلط جگہ آ گئی ہیں۔ فلاں آؤٹ ڈور میں چلی جائیں۔ اس طرح میں گھومتی گھومتی پھر آپ کے پاس''..... وہ رک گئی اور بولی ''اب آپ مجھے کہاں بھیجیں گی''۔

وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوگئی۔ کیا ڈاکٹر تشخیص کے لئے نااہل ہو چکے ہیں..... چلو میں ہی یہ چیلنج قبول کرتی ہوں اس نے سوچا اور پوچھا

''تو آپ نے ابھی تک کوئی علاج نہیں کروایا۔''

''ہومیو پیتھک علاج کروایا تھا۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔''

''آپ کب سے بیمار ہیں..... اور سب سے پہلے کیا تکلیف شروع ہوئی تھی۔''

''وہ تو جی روحانی تکلیف تھی۔ غالباً روح کا علاج تو آپ کے پاس نہیں ہوتا جو چیز دکھائی نہ دے۔ سائنس تو اس کا انکار کر دیتی ہے اور روح نظر نہیں آتی۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں جب لیبارٹری یا سکین میں کچھ نظر نہ آئے تو تشخیص مشکل ہوتی ہے۔ عام طور پر ایسی بیماریاں ذہنی ہوتی ہیں تو سائیکاٹرسٹ علامات سے اِن کا علاج کرتے ہیں۔ آپ کو میں ٹیسٹ لکھ کر دے رہی ہوں یہ کروالیں جب رپورٹ آ جائے تو پھر دیکھتے ہیں۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔''

''اسی ہسپتال میں ہو جائیں گے۔ یا باہر سے کروانے پڑیں گے۔ باہر تو بہت مہنگے ہونگے۔''

''میرا خیال ہے یہاں سے ہی ہو جائیں گے۔ اور اگر ضرورت پڑی تو ہم خود باہر سے کروائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔''

''آپ کہیں پرائیویٹ پریکٹس کرتی ہیں تو اپنا پتہ بتا دیں۔'' فرحت نے پوچھا۔

یہاں سے اتنا تھک کر جاتے ہیں۔ شام کو کام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر گھر اور فیملی کو بھی وقت دینا پڑتا ہے اس نے توضیح پیش کی۔''

''دراصل یہاں اتنا وقت نہیں ہوتا کہ آپ کسی مریض کو تسلی سے دیکھ سکیں اور مریض بتا سکے کتنی باتیں ان کہی رہ جاتی ہیں تو آپ دوائی کیسے لکھ دیتے ہیں''۔ فرحت نے سوالیہ انداز میں پوچھا.....

''ہاں یہ تو درست ہے بس اندازہ ہی ہوتا ہے باقی شفا تو پروردگار کے ہاتھ میں ہے'' ڈاکٹر وردہ نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے۔

''میں نے تو پڑھا تھا کہ سائنس میں تجربہ اور مشاہدہ کام آتا ہے۔ اندازہ نہیں.....'' فرحت نے جرح کی۔

اس نے بے بسی سے دیکھا اور خاموش رہی وہ سمجھ رہی تھی کہ اِن سوالوں کے پیچھے کوئی طوفان چھپا ہے یا کہانی..... دونوں صورتوں میں سرجری کی ضرورت ہوگی۔ اس نے خود سے سوال کیا، کیا تم یہ آپریشن کر سکو گی؟ تجربہ ہی کتنا ہے! یہ معاشرہ، دنیا، لوگ، مسائل کے انبار..... اور پھر خاص طور پر عالم نسوانیت کو تو ہمیشہ نظر انداز ہی کیا گیا ہے۔ اس کے دل سے جواب آیا، تو پھر کچھ کرو نا، یہ تو قسمت کی بات ہے تم بھی اس کی جگہ..... ہو سکتی تھیں اس نے فیصلہ کر لیا۔ اور بڑے اعتماد سے بولی۔

''جمعے کے روز میرا ہاف ڈے ہوتا ہے اس دن ہماری ایک کلینیکل میٹنگ ہوتی ہے جو مشکل کیس ہوتے ہیں ان کے بارے میں سارے ڈاکٹرل بیٹھ کر رائے دیتے ہیں۔ آپ اس دن آ جائیں۔''

''کتنے بجے آؤں۔''

''میٹنگ گیارہ بجے شروع ہوتی ہے۔ آپ نو بجے آ جائیں ہم دو گھنٹوں میں کافی بات چیت کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں نہیں کمرہ نمبر 14 میں آنا ہے۔ مزید کوئی ریکارڈ ہو تو وہ بھی لائیے گا کوئی ایکسرے سی ٹی سکین، الٹراساؤنڈ، پرانی پیتھالوجی کی رپورٹیں جو دوائیاں استعمال کی ہیں وہ بھی ساتھ لائیں۔''

''بہت بہت شکریہ۔ اب مجھے اجازت ہے۔''

''جی آپ جا سکتی ہیں۔''

اس کے جانے کے بعد اس نے سکھ بلکہ اطمینان کا سانس لیا کہ

اس نے سچے دل سے اس کا علاج کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

گھر آئی تو ڈاکٹر ساجد کو بتایا.....اپنی کارکردگی بھی.....وہ بولے۔

''میرا خیال ہے کہ وہ ذہنی مریضہ ہے کچھ لوگوں کو مختلف ڈاکٹروں کے پاس پھرتے رہنے کی عادت ہوتی ہے ان کی تسلی نہیں ہوتی۔''

''لیکن ساجد آج اس کا رویہ بالکل مختلف تھا۔نرم،شکست خوردہ سا اور اس نے سب باتوں کا ٹھیک جواب دیا۔طنز کے تیر بھی نہیں چلائے ورنہ میں ہمت ہار دیتی۔''

''تم نے اپنے دل میں اس کی وجہ سے جو غلط فہمی تھی اسے دور کرلیا تو سب ٹھیک لگا کیونکہ دوسروں کو ہم اپنی شخصیت کے آئینے میں دیکھتے ہیں اور دل میں موجود تعصب ہمیں وہی کچھ دکھاتا ہے جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''آپ کا جواب نہیں ہر بات کی وضاحت آپ کے پاس موجود ہوتی ہے۔'' تھوڑی دیر رک کر بولی.....''اب نہ جانے اصل بیماری کیا ہوگی۔ڈاکٹر ساجد آپ میری مدد کرینگے نا.....شاید ہم یہ معمہ حل کرلیں میں نے اسے جمعے کی صبح کو بلایا ہے۔کلینیکل میٹنگ سے پہلے.....کیا خیال ہے یہ کیس وہاں پیش کیا جاسکتا ہے۔''

''جب تک ہمارے پاس Provisional ڈایا گونوسز اور ٹیسٹ نہ ہوں تو مشکل ہے، وہاں ہمارا مذاق اڑایا جائے گا کہ ہم نے کچھ بھی نہیں کیا اور بورڈ کے سامنے لے آئے۔اس لئے سب سے پہلے تو تفصیل سے ہسٹری لو۔دیکھو کوئی پوائنٹ بھول نہ جانا۔''

''مثلاً.....؟'' ڈاکٹر وردہ نے سوالیہ نظروں سے پوچھا۔

بیماری کی ہسٹری،فیملی ہسٹری،سوشل ہسٹری،شادی سے پہلے اور بعد کی ہسٹری،جاب کی ہسٹری،بچپن سے لے کر اب تک کوئی حادثہ،واقعہ،مصیبت کا موڑ جس نے اس کی زندگی کو متاثر کیا ہو،ذہنی ہسٹری،روحانی ہسٹری،خوشحالی یا غربت یعنی Status کی ہسٹری، خاندان اور دوستوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت،کوئی ایسی شخصیت جو اس کیلئے بہت اہم ہو،اس کو بلا کر اکیلے میں مریضہ کے بارے میں معلومات اکٹھی کرو تاکہ درست تشخیص ہو اور پائیدار صحت حاصل ہو سکے۔''

ڈاکٹر وردہ حیرت سے ساجد کو دیکھے جارہی تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو.....؟''

''ہم پاکستان میں ایک مریض کو اتنا وقت اور اہمیت دے سکتے ہیں یا کبھی دیا ہوگا۔یہ آپ نے سوچا بھی کیسے.....اور کہاں سے سیکھا ہے''۔

''جب میں پمز اسلام آباد میں ایم ڈی کرنے گیا تھا تو وہاں چار سالوں میں اور کیا سیکھا ہے۔ہم اس کی ایک چیز یا بیماری کو لے کر اس کا علاج کرتے ہیں جبکہ اس کی پوری شخصیت اس سے متاثر ہوتی ہے ہم اس کو فراموش نہیں کرسکتے۔اگر وہ ہسپتال میں داخل ہے تو واپس تو اسی ماحول میں جائے گا جس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ہمیں ایسا تو کچھ کرنا چاہیے نا کہ وہ دوبارہ بیمار ہوکر ہمارے پاس نہ آئے۔کسی نہ کسی حد تک تندرستی کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔''

''تھینکس ٹو فرحت عبداللہ۔ورنہ یہ سبق تو آپ نے مجھے بھی نہیں سکھایا۔اس لئے مریض بار بار آپ کے پاس آتے ہیں۔آپ کی ہر دلعزیزی کی وجہ سمجھ میں آرہی ہے۔''

''شکریہ شکریہ.....حیرت ہے۔بیویاں تو بہت کم خاوند کی لیاقت اور اہلیت کو تسلیم کرتی ہیں۔تم کمال کی ڈاکٹر ہو۔ذرا بھی پروفیشنل جیلسی نہیں ہے۔''

''آپ کی ترقی اور کامیابی پر تو مجھے فخر ہے۔علم تو وہ نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے نازل فرمائی ہے۔باقی سب ضرورت کی چیزیں زمین اور آسمان کے درمیان رکھ دی ہیں اچھا آپ میرے لئے دعا ضرور کیجئے۔''

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

مہندی کا رنگ

رضوان علی کے گھر ان کی سب سے لاڈلی اور چھوٹی بیٹی کرن کی شادی تھی۔ گہما گہمی اور رونق اپنے عروج پر تھی۔ عزیز رشتہ داروں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ شادی میں صرف ایک ہفتہ باقی تھا۔ باہر کے ملکوں سے قریبی عزیز اس خوشی میں شرکت کیلئے پہنچ رہے تھے۔ بڑے دونوں بچے سمیر اور عائزہ اپنے اپنے بچوں کے ساتھ پندرہ دن پہلے ہی آ چکے تھے۔ گھر میں ہر روز ہی ڈھولکی اور گیتوں کی چھوٹی چھوٹی محفلیں جم رہی تھیں۔ ہر فرد شادی کے کاموں میں مصروف نظر آتا تھا۔

رضوان علی تو بہت زیادہ خوش تھے اور یہ خوشی اسی وقت دوچند ہوگئی جب ان کو اپنے اکلوتے بھتیجے کی طرف سے اطلاع ملی کہ وہ بھی شادی سے ایک روز پہلے شرکت کیلئے پہنچ رہا ہے۔

جواد عرصہ پانچ سال بعد لندن میں بغرض تعلیم اور پھر ملازمت مقیم تھا۔ فون پر رابطہ ضرور رہا۔ اب اس کے آنے کی خبر سے رضوان علی بہت زیادہ خوش نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے فوراً عالیہ بیگم کو آواز دی۔

''عالیہ بیگم ذرا اِدھر تو آؤ بہت زبردست خبر ہے۔''

''ایسی کیا خبر ہے جلدی بتایئے۔'' عالیہ بیگم سننے کے لیے بے چین نظر آ رہی تھیں۔

''بھئی ہمارا جواد بھی پہنچ رہا ہے۔ شادی سے ایک دن پہلے۔ ابھی ای میل ملی ہے۔''

رضوان علی اپنی رَو میں کہتے چلے گئے۔ ادھر عالیہ بیگم کے چہرے کا رنگ ایکدم بدل گیا۔ یہ خوشی آپ کو ہی مبارک ہو۔ مجھ سے اس سلسلے سے کچھ بات مت کیجئے۔ یہ میری بیٹی کی خوشی کا موقع ہے۔ میں کوئی بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہتی۔'' عالیہ نے ذرا سختی سے کہا اور باہر چلی گئیں۔

رضوان علی تو خوشی میں سب کچھ بھول گئے تھے۔ ان کو بھی اب معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ خاموشی سے اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل ہونے لگیں دل و دماغ پر پڑے ماضی کے پل پل کی یادوں کے پردے آہستہ آہستہ سرکنے لگے۔ اور وہ گزرے ہوئے وقت میں کھو سے گئے۔

ماں، باپ کی وفات کے بعد بڑے بھائی فیضان علی نے کبھی بھی رضوان کو والدین کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا تھا۔ دینی، دنیاوی تعلیم اور تربیت میں مال اور اپنی محبت خلوص سے ہمیشہ ساتھ دیا۔ رضوان کو احساس تھا کہ آج اس کی اتنی بڑی پوسٹ، گھر بار، سب اللہ کا کرم اور اس کے بعد بھائی صاحب کی محنت کا پھل ہے۔

بھائی صاحب ماشاء اللہ اچھے بڑے عہدے پر تھے۔ ان کی شادی بھی تاجر گھرانے کی لڑکی سے ہوئی جو جہیز میں ایک بڑا گھر اور زرعی فارم لائی تھی۔ شکل وصورت معمولی تھی۔ اور مزاج کافی حاکمانہ، جس کے باعث میاں صاحب کچھ اپنی نیک دل فطرت سے مجبور اور کچھ مصلحت پسندی کی وجہ سے ہمیشہ گھریلو معاملات کو نظر انداز کر دیتے تھے۔

ادھر رضوان کی شادی عالیہ سے ایک بہترین خواب کی تعبیر معلوم ہوتی تھی۔ وہ شکل وصورت میں اچھی اور اس کے ساتھ بہت محبت اور عزت دینے والی تحمل مزاج بیوی ثابت ہوئی۔ بھائی صاحب کا گھر دس سال کے بعد بھی اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ عالیہ جب اس گھر میں آئی تو اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ بڑی بھابھی کافی تیز مزاج کی ہیں۔ لیکن اس نے ان کے غصہ کو اکثر یہ کہہ کر ٹال دیا کہ شاید اولاد نہ ہونے سے وہ چڑ چڑی ہوگئی ہوں۔ اس لئے وہ بھائی صاحب اور بھابھی کی بہت عزت کرتی تھی۔ لیکن کئی دفعہ رضوان نے خود دیکھا کہ وہ عالیہ سے بہت ہتک آمیز رویہ اختیار کر لیتی ہیں۔ عالیہ نے کبھی اس کا ذکر رضوان سے نہیں کیا کہ گھر میں بدمزگی نہ ہو جائے۔ نوکر چاکر ہونے کے باوجود عالیہ تمام وقت کاموں میں مصروف تھی۔ اکثر تو اس کو شوہر کے پاس آنے کے

لیے بھی وقت نہ ملتا۔ رضوان عجیب شش و پنج میں مبتلا تھا۔ ایک طرف نیک اور محبت کرنے والی بیوی دوسری طرف باپ کے جیسا بھائی۔ بس خاموشی میں ہی عافیت جانی کہ شاید کچھ عرصہ بعد حالات بدل جائیں!

''عالیہ بیگم ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' رضوان علی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں ضرور بتایئے میں سن رہی ہو۔'' عالیہ بیگم بھی اس وقت کافی سنجیدہ نظر آ رہی تھیں۔

''بھائی صاحب مجھے ماسٹرز کرنے کے کیلئے لندن بھیجنا چاہتے ہیں کہہ رہے تھے کہ ڈیڑھ 2 سال کی بات ہے اگر رہنے کا اچھا انتظام ہو گیا تو تم عالیہ کو بھی بلا لینا۔'' رضوان علی نے عالیہ کو بتا دیا۔

''رضوان خبر تو اچھی ہے بھائی صاحب تو ہمیشہ ہم لوگوں کے لیے اچھا ہی سوچتے ہیں۔ مگر آپ جانتے ہیں ہمارے ہاں بھی ایک ننھا منا مہمان آنے والا ہے۔ پھر میری طبیعت بھی آج کل ٹھیک نہیں ہے۔ آپ ہوتے ہیں تو بہت حوصلہ رہتا ہے۔ دیکھیں میرا دل تو ابھی سے کتنا دھڑک رہا ہے۔ عجیب عجیب خیالات آ رہے ہیں کہ شاید آپ کے بغیر میں خوش نہیں رہوں گی۔'' عالیہ بیگم نے بہت دل گرفتگی سے کہا۔

''ارے ارے یہ کیا بات ہوئی تم تو بہت سمجھدار اور بہادر بھی ہو۔ میں خود کہاں جانا چاہتا تھا..... بس بھائی صاحب کا کہنا ہے کہ بہت اچھا موقع ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ تمہارے کوئی قریبی رشتہ دار اس شہر میں نہیں۔ لیکن تم فکر مت کرو میں گھر کا انتظام کرتے ہی تمہیں بلا لوں گا۔ خود بھائی صاحب نے مجھے یقین دلایا کہ وہ تمہارا بہت خیال رکھیں گے۔ ظاہر ہے ان کو بھی گھر کی سیاست اور اپنی بیوی کے مزاج کا اندازہ تو ہے۔ اور تم سوچو ہم کس قدر خوش نصیب ہیں کہ اللہ اولاد کی خوشی دے رہا ہے۔ انشاءاللہ ہم دونوں مل کر اپنے بچوں کو پالیں گے اور پہلے بچے کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے میں تو روز فون پر تم سے باتیں کروں گا اور بچے کے لیے وہاں ڈھیروں شاپنگ بھی ہو گی۔ اب خوش ہو جاؤ اور بس ایک ہفتہ ہے میرے جانے میں، خوشی سے رخصت کرنا۔'' رضوان علی نے عالیہ کو منا ہی لیا۔

رضوان علی کو گئے پانچ ماہ ہو گئے تھے۔ رہنے کا الگ معقول انتظام نہ ہونے کی وجہ سے وہ عالیہ کو نہ بلا سکے۔ البتہ ان کے اور آنے والے بچے کے لیے بہت ساری شاپنگ کر کے بھجوا دی تھی۔ ادھر اس تمام عرصہ میں کئی مرتبہ عالیہ بھابھی کے ناروا سلوک پر دل برداشتہ سی نظر آتی تھی۔ سب سے بڑی بات کہ وہ اس کو ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے بھی جانے کی اجازت نہیں دیتیں کہ کوئی ضرورت نہیں کہ ہر ہفتہ چیک اپ کروایا جائے، یہ تو ہسپتال والوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ اگر میرے ہاں اولاد نہیں ہوئی تو کیا، اتنا تو معلوم ہے مجھے!

عالیہ مجبور تھی لیکن رضوان علی کو کچھ بھی نہ بتانے کی قسم کھا لی تھی تا کہ وہ دلجمعی سے پڑھائی مکمل کر کے وقت پر واپس آ جائیں۔

بچے کی پیدائش میں ڈھائی ماہ باقی تھے عالیہ کی صحت زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ ایک دن اس کی ماسی نے بھی کہا کہ باجی آپ کا رنگ بہت پیلا لگتا ہے آپ ضرور ڈاکٹر کو دکھا دیں۔ ادھر رضوان علی بھی اس کو برابر چیک اپ کروانے کی تاکید کر رہے تھے۔ عالیہ نے سوچا اب میں اکیلے بغیر بتائے رکشہ لے کر چلی جاؤں گی۔ شام پانچ بجے بھابھی نے عالیہ کو آواز دی کہ ذرا گرم پانی کی بالٹی میرے باتھ روم میں رکھ دو ماسی گئی ہوئی ہے۔ عالیہ نے چاہا کہ صاف انکار کر دے مگر پھر بات بڑھ جانے کے ڈر سے خاموش رہی اور بالٹی پہنچا دی۔

آدھا گھنٹہ نہ گزرا ہو گا کہ عالیہ کی حالت خراب ہو گئی۔ بھائی صاحب آئے تو فوراً اسے ہسپتال لے گئے۔ خون کافی ضائع ہو گیا تھا۔ ساڑھے چھ ماہ کا بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔ عالیہ کو کئی بوتل خون چڑھایا گیا۔ ڈاکٹروں نے بھائی صاحب کو بتایا کہ مریضہ بہت ہی کمزور ہے۔ خون کی کمی کی وجہ سے بچے کی نشوونما رک گئی تھی اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ اس کے معمول کے چیک اپ نہیں کروائے گئے۔

بھائی صاحب کے ذریعہ رضوان علی کو جب یہ خبر ملی تو وہ کورس چھوڑ کر آنا چاہتے تھے لیکن بھائی صاحب نے ان کو سمجھا بجھا کر روک دیا کہ میں خاص طور سے عالیہ کا خیال رکھوں گا۔ عالیہ کی حالت ذہنی طور سے دن بدن خراب ہوتی گئی۔ کھانا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ ہر وقت اندر کمرے میں بیٹھی خود سے باتیں کر رہی ہوتی۔

ایک روز بھابھی کمرے میں گئیں اور ناگواری سے کہنے لگیں۔

''یہ کیا تم ہر وقت کمرے میں گھسی رہتی ہو۔ایک ساڑھے چھ ماہ کے بچے کا ایسا سوگ منا رہی ہو جیسے جوان بیٹا فوت ہو گیا ہے۔اب کام دھندے میں لگو..... ڈپریشن کا بہانہ چھوڑو۔اب ہمارے ہاں دس بارہ سال سے اولاد نہیں ہوئی تو کیا کریں..... یوں دنیا سے بے زار تو نہیں رہا جاتا۔'' ان کے اس قسم کے لیکچر سن کر عالیہ مزید ڈپریشن میں چلی جاتی۔ادھر اس کی بہنوں کے فون آتے رہتے امریکہ سے کہ تم ویزا لگوا لو ہمارے پاس آ جاؤ، ہمارا آنا تو بچوں کی پڑھائی کی وجہ سے ممکن نہیں۔ لیکن عالیہ تو صرف اپنے بچے کو جس کی اس نے صرف ایک جھلک دیکھی تھی، گول مٹول، خوبصورت سا بنا..... اور شوہر کو یاد کر کے بے قرار سی رہتی تھی۔ پھر جب رضوان علی ماسٹرز کی ڈگری لے کر لوٹے تو ان کو عالیہ بیگم کی صورت میں نحیف ونزار، غنودگی میں رہنے والی، ہر بات پر رونے اور بچے کو بار بار پکارنے والی بیوی سے ملنا ہوا۔وہ یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ان کو اندازہ تو تھا لیکن بھائی صاحب نے ان کو یہ سب کچھ نہیں بتایا۔بس وہ کہتے تھے کہ بچے کا بہت غم ہے ہم اس کا علاج کروا رہے ہیں۔اور آج ان کی خوبصورت خوش اور صحت مند بیوی کا یہ حال ہو گیا۔ انہوں نے بھائی اور بھابھی سے بہت گلہ کیا لیکن ان کا جواب تھا کہ ہم نے بہت خیال رکھا لیکن عالیہ نے ضد میں دوا کھانی چھوڑ دی، کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھاتی تھی۔ پھر ہم کیا کرتے!

رضوان علی نے آنے کے بعد ایک ماہ کے اندر عالیہ کے علاج اور دیکھ بھال کے ساتھ اپنے لیے بیرون ملک جاب کی تلاش شروع کر دی۔ اتفاق سے لندن سے ایک بہترین آفر آئی اور یوں وہ عالیہ کے ساتھ لندن آ گئے۔اب عالیہ کو ان کی بیماری کے حصار سے نکالنا بہت محنت طلب مرحلہ تھا۔ دواؤں، غذا کے ساتھ ہمدردی، محبت اور ساتھ کی اشد ضرورت تھی جس کو رضوان علی جیسے محبت کرنے والے شوہر نے خوب نبھایا۔ کھانا خود بناتے اور اپنے ہاتھوں سے کھلاتے۔ ہر چھوٹی چھوٹی بات کی حوصلہ افزائی کرتے۔غرض ڈیڑھ دو سال کا عرصہ گزر گیا اور رضوان علی کی محنت رنگ لائی۔ عالیہ بیگم زندگی کی طرف لوٹ آئیں۔وہ خود رضوان علی کی احسان مند تھیں کہ زندگی کی طرف لانے میں انہوں نے اپنی محبت کا حق ادا کر دیا۔

عالیہ بیگم اور رضوان علی کا گھر ماشاءاللہ خوب پھل پھول رہا تھا۔ ایک بڑا بیٹا سمیر اور بیٹی عائزہ دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔اس کے بعد رضوان علی اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان شفٹ ہو گئے تھے۔ بڑے دونوں بچے دبئی میں تھے۔کرن دس سال کی تھی جب یہ لوگ پاکستان آئے۔ آج اسی کی شادی تھی۔

اُدھر بھائی صاحب کے ہاں شادی کے تیرہ سال بعد اللہ پاک نے ایک بیٹا جواد کی صورت میں عطا کیا تھا۔اس کی پیدائش پر بہت خوشیاں منائی گئیں۔ بہت ناز ونعم لاڈ پیار میں پلا۔لیکن بدقسمتی کہ پیدائش کے آٹھ سال بعد دونوں ماں باپ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں چل بسے۔جواد شروع میں نانی کے پاس رہا۔اتنی محبت اور لاڈوں میں پلا بچہ یوں ایک دم تنہا ہو گیا۔ بہر حال نانی نے بہت سنبھالا، تربیت اور تعلیم کا بھی خیال رکھا لیکن چھ سال بعد وہ فوت ہو گئیں تو ماموں ممانی نے یہ سمجھ کر قبول کر لیا کہ تنہا بہت بڑی جائیداد کا وارث ہے۔نانی کی زندگی میں تو وہ دولت کو ہاتھ نہ لگا سکتے تھے لیکن اب تو اپنی من مانی کرنے کا بہترین موقع مل رہا تھا۔ جواد اس وقت شہر کے بہترین اسکول میں او لیول کے پہلے سال میں تھا۔ ماموں ممانی تو دولت کے لالچ میں اس کے ناز و نخرے اٹھاتے رہے، چھ ماہ بعد ان کو معلوم ہوا کہ جواد کی تمام جائیداد کی دیکھ بھال اس کے چچا رضوان علی کرتے ہیں۔ اور اس کے لیے ایک بڑے وکیل کی خدمات بھی حاصل ہیں۔ یہ سب کام اصل میں جواد کی نانی نے رضوان علی سے کہہ کر کروایا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ تمہارا بھتیجا ہے تم اس کے اصلی سرپرست ہو۔ حالانکہ رضوان علی نے یہ بات ہمیشہ عالیہ سے چھپائی کیونکہ ان کی حالت اب بھی ایسی تھی کہ وہ بھابھی سے منسلک کسی بات کو سننے میں ڈپریشن کا شکار ہو سکتی تھی۔

ادھر ماموں ممانی نے دیکھا کہ ملنا ملانا کچھ نہیں تو انہوں نے اس کا سامان باندھا اور اس کو رضوان علی کے گھر چھوڑ آئے۔ رضوان علی عجیب کشمکش کا شکار۔ عالیہ بیگم تو جواد کا نام سننا ہی پسند نہیں کرتی تھیں۔

البتہ بچے کبھی کبھی اپنی امی کو سمجھاتے تھے کہ جواد کا اس میں کوئی قصور نہیں بلکہ وہ تو خود مظلوم ہے اس کے ماں باپ اس سے جدا ہو گئے۔ عالیہ بیگم بھی اس بات کو مانتی تھیں لیکن نہ جانے اس کا نام سننے میں ان کی طبیعت خراب ہونے لگتی وہ کہتیں کہ اگر وہ یہاں آیا تو پھر میں پہلے کی طرح بیمار نہ ہو جاؤں۔ وہ ایسی ماں کا بیٹا ہے جس نے مجھے اتنی اذیت میں رکھا۔ حالانکہ میں خود سے لڑتی ہوں کہ اس بچے کا کوئی قصور نہیں وہ یتیم مسکین بچہ ہے۔ لیکن کیا کروں میرے دل کا خوف ختم نہیں ہوتا۔ عالیہ بیگم بالکل رونے والی ہو جاتیں۔

''عالیہ بیگم تم بالکل حق بجانب ہو۔ ہم اس کو باہر انیکسی میں رکھیں گے۔ دو سال تک وہ یہاں رہے گا پھر باہر پڑھنے چلا جائے گا۔'' رضوان علی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بس وہ گھر کے اندر نہ آئے کھانے وغیرہ کا خیال ضرور رکھا جائے گا۔''

عالیہ نے اپنے دل کی بات بتا دی۔ رضوان علی بھی مطمئن ہو گئے تھے۔ رضوان علی نے ایک دو مرتبہ گزری باتوں کا جواد سے ذکر کیا تھا صرف یہ جائزہ لینے کیلئے کیا اس کو کچھ معلوم ہے تو اندازہ ہوا کہ ان کی نانی صاحبہ نے اس کی واقعی بہترین تربیت کی ہے۔ اس کو کچھ ضروری باتیں بتانے کے ساتھ اپنے عزیز رشتہ داروں کی اہمیت کا بھی احساس دلایا ہے کہ اب چچا تمہارے لیے سب سے قریب اور مخلص ہستی کا درجہ رکھتے ہیں وہ تمہارے باپ کی جگہ ہیں۔ رضوان علی کو اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی بگڑا ہوا یا دل میں کینہ رکھنے والا نوجوان نہیں بلکہ بہت متحمل مزاج اور صلح جو طبیعت کا حامل ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کو دیکھ کر انہیں بھائی صاحب کا وجیہہ سراپا، اونچا قد و قامت اور محبت والا برتاؤ یاد آ گیا۔

دو برس چچا کی انیکسی میں رہنے کے بعد وہ پڑھائی مکمل کرنے کے لیے باہر چلا گیا اور پھر وہیں نوکری کر لی۔ رضوان علی کی آنکھیں بھتیجے کو دیکھنے کو ترستی تھیں۔ مگر عالیہ کی وجہ سے ضبط کرتے۔

رضوان علی نے جائیداد کے تمام کاغذات جواد کے حوالے کر دیئے تھے کیونکہ اب وہ عاقل و بالغ تھا۔

نہ جانے بند کمرے میں ماضی کے گزرے واقعات کے تانے بانوں میں الجھے کتنا وقت گزر چکا تھا کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی، ایک دفعہ نہیں دو تین دفعہ۔

''ارے رضوان حد ہو گئی آپ یہاں آ کر سو گئے اِدھر کرن کے سسرال سے لوگ آئے ہیں مہر وغیرہ کا طے کرنے جلدی آیئے۔'' عالیہ بیگم عجلت میں کہہ کر چلی گئیں۔

اگلا دن بہت اہم تھا۔ مایوں اور مہندی ایک ساتھ ہو رہی تھی۔ آج کرن کے والدین خوشی سے نہال ہو رہے تھے ان کی بیٹی ایک بہت معزز پڑھے لکھے خاندان میں بیاہی جا رہی تھی داماد بھی خوبصورت اور قابل ملا تھا۔ تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔

گھر کے بہت بڑے لان میں مہندی کی تقریب کی سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی جا بجا رنگین لائٹوں کے جلتے بجھتے قمقمے عجب بہار دکھلا رہے تھے۔ تازہ خوشنما پھولوں کی مہک سے سانسیں معطر ہو رہی تھیں۔ رنگ برنگے دیدہ زیب لباس اور تاروں بھرے آنچل ماحول کو اور مسحور کن بنا رہے تھے۔ گیٹ کے پاس قطار میں تمام لڑکیاں ہار پھول لیے دلہا والوں کے انتظار میں کھڑی تھیں۔

آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ دلہا والے بھی آ گئے لیکن دلہا میاں کے نہ آنے سے محفل کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا۔ سنا یہ گیا کہ ان کے گھر دلہا مہندی میں شرکت نہیں کرتا۔ بہر حال تقریب حسب پروگرام منعقد ہوئی۔ اور سب نے خوب لطف اٹھایا۔ جواد کی فلائٹ بھی لندن سے آج ہی پہنچی تھی۔ عالیہ بیگم کی بہنوں نے انہیں بہت سمجھایا تھا کہ بالکل نارمل رہیے گا۔ ادھر رضوان علی جب اپنے بھتیجے سے گلے ملے تو بے اختیار اپنے بڑے بھائی کی یاد آ گئی۔ جواد ہو بہو اپنے والد کی جوانی کی تصویر لگ رہا تھا۔ سمیرا اور عائزہ بھی اس سے مل کر بہت خوش تھے۔ اور جواد بہت خوش نظر آ رہا تھا کہ اتنی مدت کے بعد اپنے وطن میں اپنے لوگوں کے درمیان تھا۔

اگلے دن شہر کے بڑے ہوٹل میں بارات کی تقریب کا شاندار انتظام کیا گیا تھا۔ کرن دلہن کے روپ میں شہزادی لگ رہی تھی۔ میک

اپ کا مدار کپڑے اور زیورات کی جھلمل نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ دوسری طرف لوگ باہر بارات کے انتظار میں کھڑے تھے۔ دس بج چکے تھے۔ پھر گیارہ بجے تو رضوان علی نے سمیر سے کرن کے سسرال کو فون کروایا۔ معلوم ہوا بس نکلنے والے ہیں کیمرہ مین دیر سے آئے تھے۔ اب بارہ بج گئے تو پھر عالیہ بیگم اور رضوان علی کو گھبراہٹ شروع ہوگئی۔ تقریب میں شامل مہمان بھی انتظار کی کیفیت سے تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔

جب رات کے ایک بج گئے اور بارات کا کوئی پتہ نہ تھا، تو پھر طے یہ ہوا کہ چند بزرگ دلہا والوں کے گھر جا کر اصل ماجرا معلوم تو کریں۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ صاحبزادہ تو اس شادی کیلئے بالکل تیار نہیں تھا ماں اور بہنوں نے منا کر رضامند کر لیا تھا اور عین شادی کے دن آٹھ بجے کی فلائٹ سے وہ دبئی چلا گیا۔

یہ ایک ایسی خبر تھی کہ ماں باپ کا دل ہی جانتا تھا ان پر کیا گزری۔ عالیہ بیگم شدید صدمے میں تھیں۔ ان کو سکون کی دوا دی گئی۔ کرن کی حالت عجیب تھی۔ وہ تو ایک بے حسی کے عالم میں خاموش بیٹھی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ کرن کی چھوٹی خالہ رضوان علی کو الگ کونے میں لے گئیں۔

''رضوان بھائی میں جو بات آپ سے کرنے والی ہوں ذرا غور سے سنئے گا۔ کرن کو بغیر شادی کیے گھر لے گئے تو نہ جانے اس پر کیا گزرے۔ پھر عالیہ آپی کا تو آپ کو معلوم ہے وہ اتنا بڑا صدمہ برداشت نہ کر پائیں گی۔'' چھوٹی خالہ نے جلدی جلدی کہا۔

''ہاں ہاں یہ سب تو ٹھیک ہے اب اس کا کوئی حل بھی ہے یا نہیں۔'' رضوان علی نے گھبراتے ہوئے سوال کیا۔

''بالکل ہے اگر آپ اور عالیہ آپی تیار ہوں کرن کو تو میں خود منا لوں گی۔'' چھوٹی خالہ بولیں۔

''جلدی بتاؤ بھئی میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔'' رضوان علی سے تو ٹھیک سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

''کیوں نہ کرن کی شادی جواد سے کر دی جائے۔ ماشاءاللہ کتنا خوبصورت اور قابل لڑکا ہے پھر اپنا خون ہے اس سے بڑھ کر کونسا رشتہ ہو گا۔'' چھوٹی خالہ نے خوشی سے کہا۔

''بات تو بالکل ٹھیک ہے لیکن یہ ممکنات میں سے نہیں عالیہ بیگم تو سنتے ہی چراغ پا ہو جائیں گی۔'' رضوان علی نے ہارے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔

اور وہی ہوا جب عالیہ بیگم کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی تو وہ ایک دم غصہ اور گھبراہٹ سے کھڑی ہو گئیں۔ ان کو ان کے تمام قریبی عزیزوں نے وقت کی نزاکت کا احساس دلایا۔ پھر جواد کے اندر کوئی ایسی بات نہ تھی کہ یہ رشتہ قبول نہ کیا جا سکے۔ لیکن پھر بھی عالیہ بیگم گم سم سی بیٹھ گئیں۔ شاید ماضی کی یادیں یا مستقبل کے اندیشے انہیں پریشان کر رہے تھے۔ جواد کو بھی تمام حالات کا علم ہو چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا عالیہ بیگم کے پاس آیا۔ ''چچی جان آج تک میں نے کبھی آپ سے کھل کر بات نہیں کی لیکن آج کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے میری نانی اماں نے آپ لوگوں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ خون کے رشتے کبھی ختم نہیں ہوتے بلکہ چچا جان نے تو ہمیشہ میرا بہت خیال رکھا۔ میں نے آپ کو اپنی ماں کی جگہ جانا ہے۔ بے شک آپ کو حق ہے کہ آپ مجھ سے نفرت کریں۔ لیکن مجھے اپنے سے الگ نہ کریں۔ ماں باپ کے بعد آپ ہی میری فیملی ہیں۔ رہی کرن سے شادی کی بات وہ اللہ کو منظور ہوگی تو ضرور ہوگی۔ میں آپ کو اور چچا جان کو کبھی بھی مایوس نہیں کروں گا اور کرن کو بھی بہت خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ میں تو خوش نصیب ہوں جس کو کرن جیسی لڑکی مل رہی ہے۔''

نہ جانے جواد کی باتوں میں کیسا درد تھا کہ عالیہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور بے اختیار جواد کو سینے سے لگا لیا۔ تمام افسردہ چہرے کھل اٹھے۔ کرن کے چہرے پر عجب حیرت اور آسودگی کی امتزاجی کیفیت جھلک رہی تھی۔ رضوان علی نے انتظار کر کے جاتے ہوئے نکاح خواں کو گیٹ سے واپس بلایا اور جواد کے ہمراہ سٹیج کی جانب بڑھنے لگے۔

☆.....☆.....☆

طوبیٰ احسن

گھروندا

دروازے پر دستک کی آواز سن کر سائرہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ سامنے لیٹے میاں کو پرامید نگاہوں سے دیکھا شاید وہ ہی دیکھ آئیں کہ دروازے پر کس نے دستک دی ہے۔ بالآخر ناکام ہو کر خود اپنے آپ کو سنبھال کر اٹھی، اور آہستہ قدموں سے دروازے کی طرف چلدی، ویسے تو سائرہ بڑی ہمت اور حوصلے سے کام لیتی، لیکن نویں مہینے میں سارے کس بل نکل جاتے، نواں مہینہ بڑی مشکل سے گزرتا، جسم کے بے انتہا بھاری ہو جانے کی وجہ سے اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا دوبھر ہو جاتا، خیر ماں بننا کون آسان ہے جبھی تو ماں کے قدموں تلے خدا نے جنت رکھی ہے، وہ سوچتی ہوئی دروازے کی سمت چل رہی تھی۔ ''کون'' اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے چھوٹی سی جھری سے باہر جھانکا دو لمبے تڑنگے اشخاص اور ان کے ساتھ ایک آدمی پولیس کی وردی میں۔

''اللہ خیر وہ پریشان ہوگئی۔''

''عمیر احمد ہیں۔'' دوسری طرف سے سوال کیا گیا۔

''جی موجود ہیں۔'' سائرہ نے دروازہ کھولے بغیر کہا۔

''باہر نکالو اس کو۔'' باہر موجود شخص نے غصہ اور طیش بھری آواز میں کہا۔

سائرہ کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ انجانے خوف اور خدشات سے کسی انہونی کے خوف سے وہ سہم گئیں۔ سارے جسم میں درد کی لہریں نمودار ہونے لگیں۔ کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ اس نے دیوار کو بمشکل تھامتے ہوئے سہارا لینے کی کوششیں کیں۔ زبان تالو سے چپک کر رہ گئی۔ حلق سے آواز نکلتی ہی نہ تھی۔ کوئی جواب نہ پا کر باہر موجود شخص کے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔

''او عمیر بد بخت آدمی، بھگوڑے نکل باہر ہمت ہے تو میدان میں آ کر مقابلہ کر۔'' شور وغل کی آواز سن کر سائرہ کے شوہر عمیر احمد باہر آ گئے۔

''کون ہے؟'' انہوں نے اونچی آواز میں کہا۔

''باہر نکلو فوراً ہماری لڑکی کو کہاں چھپا کر رکھا ہے۔ نکالو اس کو۔'' وہ لوگ غصے میں زور زور سے چیخ رہے تھے۔ گالیاں اور دھمکیاں سن کر سائرہ کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ ہاتھوں اور پیروں سے جان نکل رہی تھی۔ شور وغل بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بڑی ہمت کے ساتھ دیوار تھامے کھڑی تھی۔ شاید کوئی غلط فہمی، اس کے دل میں ایک خوش فہمی نے سر اٹھایا۔ اس نے عمیر کو غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے کا رنگ فق ہو رہا تھا۔

''تم اندر جاؤ۔'' انہوں نے سائرہ سے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ وہ لوگ تو گویا دروازہ توڑ کر اندر آنے پر تلے ہوئے تھے۔ دروازہ کھولتے ہی ایک آدمی نے عمیر کا گریبان تھام لیا۔

''کہاں ہے؟ بولو کہاں چھپایا ہے ہماری لڑکی کو بتاؤ؟''

''ایک منٹ'' پولیس والے نے مداخلت کی۔ ''یہاں پر نہیں آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ یہ آپ کا وارنٹ گرفتاری ہے۔''

وہ لوگ عمیر کو اپنے ساتھ لے گئے اور سائرہ وہ تو کھڑے قد سے گر پڑی۔

سائرہ کی آنکھ کھلی تو وہ ہاسپٹل میں تھی۔ امی اس کے قریب بیٹھی تھیں ایک لحظہ کے لیے سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے؟ پورے بدن میں درد کی لہریں گردش کر رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جسم کا کوئی عضو بھی تکلیف اور درد کی شدت کی وجہ سے ہل نہ سکے گا۔ ''کیا حال ہے بیٹا؟ کیسی طبیعت ہے۔'' امی نے پیار سے پوچھا۔

وہ خالی خالی نظروں سے امی کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ ''یہ دیکھو''

امی نے گود میں اٹھائے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ ''دیکھو کتنا پیارا بیٹا اللہ نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔''

بیٹا اس کے ذہن میں دھماکہ ہوا۔ حیرت کی انتہا نہ رہی اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ وہ ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔

''اچھا کچھ کھاؤ گی پھر بچے کو فیڈ بھی کرانا ہوگا۔''

وہ چپ رہی۔ بولنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ امی اسکوز بردستی کھلانے لگیں۔

''امی میں یہاں کیسے آ گئی۔'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''چھوڑو اس بات کو۔'' امی نے پیار سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ تم اپنے دماغ پر زور نہ ڈالو۔''

سائرہ چپ کی چپ رہ گئی۔ اس کو اچانک عمیر کا خیال آ گیا تو ایسے لگا جیسے دل میں کوئی ٹیس سی اٹھی ہو۔ آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ اس نے جلدی سے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ مبادا امی دیکھ لیں تو پریشان ہوں۔

امی تو خود بے حد فکر مند اور پریشان تھیں۔ رات کو صائم اور رائم امی کے ہاں رکے تھے۔ جب صبح امی دونوں کو چھوڑنے آئیں تو دروازہ کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا پھر اندر جا کر سائرہ کی ایسی حالت دیکھی کہ ان کے تو اوسان ہی خطا ہونے لگے۔ بچوں کو پڑوس میں چھوڑا۔ سائرہ کے ابو نیچے کھڑے تھے ان کو اوپر بلایا۔ عمیر کو سائرہ کی بابت بتانے کے لیے کئی بار نمبر ملایا لیکن رابطہ نہ ہو سکا۔ امی ابو بڑی مشکل سے سائرہ کو ہسپتال لے کر آئے۔ فوری آپریشن ہوا۔ ماں اور بچے دونوں کی جان کو سخت خطرہ تھا۔ بہت کٹھن وقت تھا۔ امی کو تو عمیر کی لاپروائی پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ لیکن ابھی سائرہ کی زندگی باقی تھی کہ وہ بچ گئی۔ خدا کے فضل و کرم سے ماں اور بچہ خیریت سے تھے۔ نجانے کیا بات تھی کہ سائرہ کی ایسی حالت ہو گئی۔ عمیر کہاں تھے اور فون کیوں ریسیو نہیں کر رہے تھے۔ بے شمار سوالات ذہن میں کھلبلی مچا رہے تھے۔

سارا دن گزر گیا رات کو عمیر کا خود ہی فون آ گیا۔ امی تو کھل ہی اٹھیں۔ تھوڑی دیر میں وہ ہسپتال میں تھے۔ سائرہ آنکھیں موندے پڑی تھی۔ بولنے کا دل نہیں چاہتا تھا۔ دل و دماغ میں ایک طوفان سر اٹھائے ہوئے تھا۔ عمیر کی آواز اس کے کانوں میں آ کر اس کو غم و غصے میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ امی کو نہ جانے کون کون سے جھوٹے قصے سنا کر مطمئن کر رہے تھے۔ دوست کا ایکسیڈنٹ، موبائل چوری اور نجانے کیا کیا۔ امی تو سدا کی بھولی تھیں۔ امی اور عمیر کی باتیں ختم نہ ہوتی تھیں اور سائرہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ عمیر کا گریبان تھام لے اور پوچھے کہ وہ لوگ کون تھے۔ کس لڑکی کا معاملہ تھا۔ لیکن ابھی موقع نہ تھا۔ سائرہ کو امی کے سامنے اپنا بھرم توڑنا گوارا نہ ہوا۔ عمیر نے بھی سائرہ کو مخاطب کرنے کی کوششیں نہیں کیں۔ اور یہ وقت بھی جیسے تیسے گزر ہی گیا۔

آج سائرہ کو ہسپتال سے چھٹی مل رہی تھی۔ امی نے عمیر سے بات کر لی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ سائرہ ان کے گھر پر چل کر رہے۔ عمیر نے رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔ دونوں بچے صائم اور رائم پہلے ہی چھوٹے تھے۔ دونوں کی عمر بالترتیب 5 اور 3 برس تھی۔ اب یہ ایک اور چھوٹا آ گیا تھا۔ سائرہ کو کمزوری بہت تھی آپریشن کی وجہ سے ڈاکٹر نے احتیاط کا مشورہ دیا تھا۔ سائرہ کا سارا سسرال لاہور میں مقیم تھا اور عمیر اپنی جاب کی وجہ سے کراچی میں رہائش پذیر تھے۔

سائرہ کو تو چپ لگی ہوئی تھی۔ کوئی بات کرتا تو جواب دے دیتی ورنہ خاموش رہتی۔ عمیر نے سائرہ سے بات کرنے کی کوششیں کیں۔ امی کے ہاں بھی روز ہی ملنے آتے لیکن سائرہ نے تو گویا چپ ہی سادھ لی تھی۔ ہوں ہاں سے آگے جواب ہی نہ دیتی تھی۔ عمیر کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ان سے ناراض ہے۔ وہ گویا تیل اور تیل کی دھار دیکھ رہے تھے۔ آخر سائرہ کو امی کے ہاں رہتے ہوئے مہینہ ہی ہو گیا تھا۔ وہ دبے لفظوں میں گھر چلنے کا کہہ رہے تھے۔ اب امی چاہتی تھیں کہ سائرہ اپنا گھر سنبھالے ان کو بھی عمیر پر ترس آنے لگا تھا۔

''بیچارہ بچہ صبر سے منہ سیے بیٹھا ہے۔ قسمت سے اچھا شوہر مل گیا تو.....'' وہ بڑبڑانے لگتیں۔ سائرہ کان اور منہ لپیٹے پڑی رہتی کسی بات کا جواب نہ دیتی۔ سوچتی کہ امی کو ساری بات بتا دے۔ لیکن زبان تالو سے چپک جاتی اور بات بیان کرنے کیلئے الفاظ کھو سے جاتے۔

اس دن تو حد ہی ہوگئی عمیر جو کہ روز ہی آتے تھے۔ 5 دس منٹ کے لیے ہی سہی لیکن آتے ضرور تھے۔ دو دن سے نہیں آئے تھے۔ امی نے لاکھ سر پٹخا کہ سائرہ فون کر کے پوچھے کہ وہ کیوں نہیں آئے۔ لیکن سائرہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ امی پریشان ہونے لگیں۔ یقیناً کوئی نہ کوئی بات ضرور سائرہ کے اس رویے کے پیچھے کارفرما تھی۔ ورنہ اس سے پہلے وہ کبھی اتنے دن شادی کے بعد ان کے پاس نہ رہی تھی۔ شام کو دروازے پر دستک ہوئی۔ سائرہ سمجھی کہ عمیر ہیں۔ لیکن دروازے پر عینی تھی۔ جو کہ عمیر کے دوست کی بیگم تھیں۔ عینی بڑی ہنس مکھ، حاضر جواب اور ملنسار خاتون تھیں۔ سائرہ کی عینی سے اچھی دوستی تھی۔

''بھابھی میں لاہور گئی ہوئی تھی۔ ابھی ہفتہ بھر پہلے ہی آئی ہوں۔ جیسے ہی پتہ چلا کہ آپ کے ہاں ایک اور چھوٹو کی آمد ہوئی ہے۔ آپ سے ملنے کا دل چاہنے لگا۔'' عینی نے چھوٹے ہاشم کو گود میں اٹھاتے ہوئے سائرہ سے کہا۔

سائرہ کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ سائرہ کا جی بھی بہل گیا۔ عینی ایسی ہی تھی جس محفل میں بھی ہوتی۔ محفل کا رنگ پلٹ جاتا۔ لبوں پر مسکراہٹ آجاتی۔ حاضرینِ محفل عینی کے چھوڑے ہوئے چٹکلوں سے محظوظ ہوتے اور محفل کا مزہ دوبالا ہو جاتا۔ اس وقت عینی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے سائرہ خوش نظر آرہی تھی۔ بچے بھی عینی آنٹی سے لپٹ رہے تھے۔ جاتے جاتے عینی نے نظر بھر کر سائرہ کو دیکھا۔

''بھابھی جو ہونا تھا وہ تو ہو بھی چکا۔ اب آپ کیوں یہاں بیٹھی ہیں۔ اپنی جگہ کو سنبھالیے آپ کیوں دوسروں کیلئے اپنی جگہ خالی کر رہی ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' سائرہ دم بخود رہ گئی۔

''یقیناً شوہر کا بغیر بتائے دوسرا نکاح آپ کی برداشت سے باہر ہے۔ لیکن اب تو اس کے گھر والے اس کو طلاق دلوا کر اپنے ساتھ لے جا چکے ہیں۔ اب آپ کو اپنے گھر لوٹنا ہی ہوگا۔ اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کیلئے۔''

سائرہ حیران پریشان اس کی شکل تک رہی تھی۔ اس کا پورا وجود دھماکوں کی زد میں تھا۔ عینی جا چکی تھی۔ وہ چپ کی چپ جہاں تھی وہیں لیٹ گئی۔ کروٹ لینے کی بھی ہمت نہ تھی۔ چھوٹو زور زور سے رونے لگا۔ لیکن سائرہ کے ہاتھوں سے گویا طاقت سلب ہو چکی تھی۔

آج امی ابو کو شادی میں جانا تھا پڑوس میں شادی تھی۔ سائرہ چپ چاپ آنکھیں موندے پڑی تھی۔ نہ تو خود سے کچھ بات کرتی، اور بات کر لو تو ہوں ہاں سے بات آگے نہ بڑھتی۔ جب سے عینی ہو کر گئی تھیں اس نے چاپ سادھ لی تھی امی کو سو سو وہم آنے لگے نہ جانے کیا معاملہ تھا۔ ویسے سائرہ کا ان کے ہاں مہینے بھر سے قیام ان کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ لیکن وہ نظر انداز کر رہی تھیں۔ اب جو وہ کبھی کبھی سوچوں کے سمندر میں ڈوب جاتی تو ان کو اور زیادہ تشویش لاحق ہوتی یقیناً سائرہ ان سے کچھ چھپا رہی تھی۔ ان کا دل ڈوبنے لگتا۔

آج تو ویسے بھی شادی میں جانا تھا، شادی میں یقیناً بہت دیر ہو جاتی۔ اور اتنی دیر سائرہ اکیلے پڑے پڑے نہ جانے کیا سوچتی رہتی۔ آخر کار کافی غور و غوض کے بعد انہوں نے عمیر کا نمبر گھما ڈالا اور ان کو اپنے شادی میں جانے کی بابت بتا کر اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ صد شکر کہ وہ راضی ہو گئے۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ دل میں یہ خیال بھی تھا۔ دونوں میاں بیوی کو تنہائی میسر آجائے تو شاید کچھ کہہ سن لیں اور معاملہ کا تصفیہ ہو جائے اور یہ اونٹ کسی کروٹ بیٹھ جائے۔ سائرہ کو بتایا تو وہ ہڑبڑا اٹھی، ''حد ہو گئی۔''

اس نے ناراضگی سے کہا۔ ''کیا ضرورت تھی، میں کیا چھوٹی سی بچی ہوں جو اکیلی نہیں رہ سکتی۔''

''آپ بھی کمال کرتی ہیں۔'' اس کی آواز رندھ گئی ''ہر جگہ میری انسلٹ کرا دیتی ہیں۔''

''ہائیں ہائیں'' امی بوکھلا گئیں۔ ''ارے میں نے کیا کر دیا۔''

وہ تعجب سے بولیں۔ ''تمہارے میاں کو بلایا ہے۔ اس میں بے عزتی کی کیا بات ہے۔''

امی کو سائرہ کا ردعمل حیران کر رہا تھا، یقیناً دال میں کچھ کالا تھا۔

امی تو شادی میں چلی گئیں اور عمیر بھی آ پہنچے امی کے جانے کے بعد خاموشی اور سکوت طاری ہو گیا۔ سائرہ دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گئی، عمیر چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے تھے آخر کار انہوں نے سائرہ کو پکارا۔

''سائرہ کیا سوچ رہی ہو۔''

''مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔'' سائرہ نے تڑخ کر کہا۔

''میں آپ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔''

''کیوں بھئی۔'' عمیر نے ہمت نہ ہاری۔ ''میں نے کیا کیا ہے۔''

کمال معصومیت سے کہنے پر سائرہ جلتے توے پر جا بیٹھی ایک تو چوری اور اوپر سے سینہ زوری۔

''آپ جو یہاں اس گھر میں عزت سے بیٹھے ہیں اگر امی ابو کو بتا دوں تو۔'' سائرہ نے دھمکی آمیز لہجے میں حملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے عمیر کو گھورا کر دیکھا۔

''مثلاً کیا؟'' عمیر نے سنجیدگی سے کہا۔

''مجھ کو عینی بھابھی نے سب بتا دیا ہے۔'' سائرہ نے انکشاف کیا۔ ''اور یہ بھی سن لیں کہ میں نے امی ابو کو اس لئے نہیں بتایا کہ وہ ہارٹ پیشنٹ ہیں اور مجھے دل و جان سے عزیز تھے۔''

''میں بھی یہی پوچھ رہا ہوں کہ عینی بھابھی نے آپ کو کیا بتایا ہے؟''

''یہی کہ آپ نے دوسری شادی کر لی تھی، وہ بھی کسی پٹھان عورت سے اس کو بھگا کر لائے تھے آپ۔'' سائرہ چبا چبا کر بول رہی تھی۔ ''اور اب اس کے گھر والے اس کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ آپ سے طلاق دلوا کر۔''

''تو پھر اب آپ کو کیا اعتراض ہے۔ جب کہ طلاق ہو چکی۔''

عمیر کے ڈھٹائی سے کہنے پر سائرہ سر سے پاؤں تک سلگ کر رہ گئی۔

''گویا آپ کو اعتراف ہے۔'' سائرہ کے لہجے میں دکھ تھا۔ عمیر کے خاموش رہنے پر وہ چلا کر بولی،

''پھر یہاں کیوں آتے ہیں۔ اب آپ کا یہاں کیا کام۔''

''میرے بچے آپ کے پاس ہیں اور میں بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

عمیر نے صاف گوئی کی انتہا کر دی۔

''یہ میرے بچے ہیں آپ کے نہیں۔'' سائرہ اتنے زور سے چیخی کہ اس کے حلق میں خراش پڑ گئی۔

''دیکھیں سائرہ معاملہ جو بھی تھا اب حل ہو چکا ہے۔ اور آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔''

''نقصان؟'' سائرہ کے لہجے میں کانچ ٹوٹنے کی جھلک تھی۔

''میرا بھروسہ اور اعتماد ٹوٹا۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور آپ کہتے ہیں کہ نقصان نہیں ہوا۔''

''میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔'' عمیر آگے بڑھ آئے اور سائرہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ توقف کے بعد بولے۔ ''دراصل پلوشہ مجھ کو ٹرین میں ملی تھی۔ جب میں پشاور آفس کے کام سے گیا تھا۔ اس کو مدد کی ضرورت تھی۔ اس کے گھر والے کسی بوڑھے آدمی سے اس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ اس نے مجھ سے مدد کی درخواست کی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس کو اپنا نام دے دوں۔''

''آپ فوراً راضی ہو گئے مدد کرنے پر'' سائرہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''یہ سوچ کر اس کی مدد کرنی چاہی کہ ایک جوان عورت جو کہ اکیلی ہے کہیں غلط ہاتھوں میں نہ پڑ جائے۔ لیکن مجھ کو بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ بذات خود ایک کرپٹ عورت تھی، برے کردار کی'' کمرے میں گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔

''.....بس آپ یہ سمجھ لیں ایک خطرناک گروہ کے چنگل میں پھنسنے سے بال بال بچا ہوں۔ پتہ نہیں کس کی دعائیں کام آ گئیں۔'' انہوں نے خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

''میں برداشت نہیں کر سکتی اور آپ کی یہ بے سروپا کہانی میری

سمجھ سے بالاتر ہے۔ جب میں آپ کی دوسری شادی کے بارے میں سوچتی ہوں تو میرا دل جلنے لگتا ہے۔ میرا ظرف اتنا اعلیٰ نہیں۔''

سائرہ سر سے پاؤں تک چادر تان کر لیٹ گئی، عمیر خاموشی اور بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے رہے پھر چپ چاپ پلٹ گئے۔

سائرہ چپ چاپ لیٹی کچھ سوچ رہی تھی امی کب سے اس کو بغور دیکھ رہی تھیں۔

''سائرہ کیا سوچ رہی ہو۔''

''کچھ نہیں امی'' سائرہ نے نگاہ چرالی۔

''دیکھو بیٹا میاں بیوی کے درمیان سو باتیں ہو جاتی ہیں لیکن گھر چھوڑنا مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ اگر عمیر سے غلطی ہوگئی ہے کچھ آپس کا جھگڑا ہے تو بات چیت سے حل ہوسکتا ہے۔ ان معصوم بچوں کے بارے میں سوچو۔''

امی نے بچوں کی طرف اشارہ کیا۔

''چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل میں لے کر نہیں بیٹھتے۔ کیا سمجھیں۔''

''بس تم سامان سمیٹو اور چلنے کی تیاری کرو۔'' امی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''کہاں چلنے کی۔'' سائرہ نے حیرت سے سوال کیا۔

''بس اب اپنا گھر سنبھالو۔ میاں کے ساتھ راضی خوشی آؤ۔''

شوہر تمہارا اکیلا ہوتا ہے۔ تم یہاں بیٹھی ہو۔'' امی نے ڈپٹ کر کہا۔'' آج میں نے عمیر کو کھانے پر بلایا ہے۔ اور کہہ بھی دیا کہ سائرہ آج تمہارے ساتھ گھر جائے گی۔''

''کیا؟'' سائرہ کی چیخ نکل گئی۔'' آپ نے اپنی طرف سے کیسے کہہ دیا''۔ سائرہ بے حد خفا ہو رہی تھی۔''میں آج نہیں جاؤں گی۔ میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔''

''بس اب تو تم کو میرا مان رکھنا ہوگا'' امی نے قطعیت سے کیا۔

''لیکن امی'' سائرہ زچ ہوگئی۔'' آپ کو نہیں پتہ کہ کیا معاملہ ہے۔'' جو بھی ہو۔ امی نے بے نیازی سے کہا۔''لیکن آج تو تم کو جانا ہی ہوگا۔''

سائرہ نے لاکھ تاویلیں گھڑیں، بے شمار بہانے تراشے لاتعداد عذر پیش کیے۔ لیکن امی کے آگے اس کی ایک نہ چل سکی۔ انہوں نے اپنا کیا پورا کیا۔ اس کو پکڑ دھکڑ کر عمیر کے ساتھ روانہ کر دیا۔

''ہم نے غلطی تو نہیں کی'' سائرہ کے جانے کے بعد ابو نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں کہا۔

''حد ہوگئی آپ کو یہ خیال کیسے آ گیا؟ صبح تو آپ کہہ رہے تھے کہ سائرہ کو اپنے گھر چلے جانا چاہیے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ کل عمیر سے بھی میں نے وعدہ کیا تھا کہ سائرہ ضرور تمہارے ساتھ چلے گی۔ لیکن میں سائرہ کی ناراضگی سے پریشان ہو گیا ہوں۔'' ابو نے افسردہ لہجے میں ابو کی پریشانی سے امی بھی فکرمند ہو گئیں۔

''آپ ہی بتائیے کیا سائرہ کا رویہ درست تھا، مہینہ ہو گیا ہے رہتے رہتے۔ وہاں پر عمیر اکیلا ہوتا ہے۔ بازار سے کھانا کھا رہا ہے، کپڑے بازار سے دھل رہے ہیں کیا یہ ٹھیک ہے؟ سائرہ ہماری اولاد ہے، لیکن اگر ہم اس کی ناجائز حمایت کریں تو کیا یہ ہمارے لیے مناسب ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن.....'' ابو مطمئن نہ تھے۔

''لیکن کیا'' امی نے ابو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''بس یہ سمجھ لیجئے کہ بیماری کا علاج کڑوی دوائی سے کرنا ہی پڑتا ہے۔ چاہے دوائی پسند ہو یا نہیں، اگر ذرا بھی مزید سائرہ کی حوصلہ افزائی کی جاتی تو وہ اور رک جاتی، لیکن لڑکیوں کی ناجائز سپورٹ خود ان کے لیے خطرناک ہے۔''

''ٹھیک ہے بھئی ٹھیک ہے۔'' ابو ہاتھ اٹھا کر بولے۔''تم تو تقریر کرنے پر آتی ہو تو بولتی ہی چلی جاتی ہو نہ کوئی فل اسٹاپ نہ ہی کوما۔''

''میں آپ کو بتاؤں زیادہ تر گھر ٹوٹنے کی وجہ کیا ہے۔'' امی نے ابو کی بات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''میکے سے سپورٹ ملتی ہے تب ہی لڑکیاں اپنا گھر چھوڑتی ہیں، ساری زندگی مسائل کا شکار رہتی ہیں، بچوں کی پرورش بھی ٹھیک طریقے

سے نہیں ہو پاتی۔ مرد کا تو اتنا کچھ نہیں بگڑتا۔''

''مرد کا کیوں کچھ نہیں بگڑتا۔'' ابو نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کل جو عمیر سے ملنے گیا تھا، تمہیں کیا بتاؤں کیا حال ہو رہا ہے اس کا، بکھرا ہوا گھر، سارے گھر میں خاک اڑ رہی تھی، وہ خود اتنا اجڑا ہوا لگ رہا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر تو بالکل پریشان ہو گیا۔''

''وہی تو میں کہہ رہی ہوں۔'' امی عمیر کی حالت سن کر گلوگیر لہجے میں بولیں۔ ''اچھا ہی کیا ہم نے سائرہ کو بھیج کر..... ''وہ سمجھدار ہے انشاء اللہ سمجھ جائے گی اور اس کی ناراضگی بھی دور ہو جائے گی، کچھ ہی دن میں ہنستی ہوئی آئے گی اپنے گھر سے عمیر کے ساتھ آپ فکر نہ کریں۔'' امی ابو کو تسلی دے رہی تھیں۔

''انشاءاللہ'' ابو نے بھی دل کی گہرائیوں سے کہا۔

پھولے ہوئے منہ، بگڑے ہوئے موڈ اور خفا چہرے کے ساتھ سائرہ اپنے گھر روانہ ہو گئی، عمیر سے تو ناراض تھی ہی۔ اب امی سے بھی روٹھ گئی، امی کو بار بار اصل معاملے سے آگاہ کرنا چاہا لیکن انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔ حتیٰ کہ سائرہ نے ان کو یہ تک کہہ دیا کہ ''اگر اب گئی تو پھر کبھی آپ کے پاس واپس نہیں آؤں گی۔''

غضب ہو گیا، جن پتوں پر تکیہ تھا، وہی ہوا دینے لگے، عمیر کے بار بار معافی مانگنے اور منانے سے بظاہر مان گئی لیکن دل میں یہ خواہش بدستور موجود تھی کہ اگر امی ابو اس کو سپورٹ کرتے تو وہ عمیر کو ناکوں چنے چبوا دیتی ایسا سبق سکھاتی کہ مدتوں یاد رکھتے لیکن افسوس اب تو کوئی چارہ بھی نہ تھا بجز صلح وصفائی۔

اس بات کو دو ماہ کا عرصہ ہی گزرا تھا کہ ابو کو فالج کا اٹیک ہوا، ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا، امی نے بڑی ہمت کے ساتھ ابو کی بہترین نگہداشت کی لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، اور ابو کے انتقال کے دو ماہ بعد ہی امی بھی ابو کے پاس چلی گئیں اور سائرہ کا میکہ جو کہ امی ابو کے دم سے ہی آباد تھا ختم ہو گیا، اس دوران عمیر نے بالکل حقیقی اولاد کی طرح امی ابو کا خیال رکھا، کیونکہ سائرہ اور عمیر کے علاوہ امی ابو کا کون تھا جو ان کا ساتھ دیتا، دونوں بھائی تو ملک سے باہر تھے اور ان کو ڈالر جمع کرنے کے سوا کسی بات کی پروا نہ تھی۔

آج سائرہ امی کے گھر میں موجود تھی ضروری سامان اکٹھا کر رہی تھی، امی ابو کی استعمال شدہ چیزیں دیکھ کر دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔

''کیا امی کو اندازہ تھا کہ وہ جلد ہی اس فانی دنیا سے رخصت ہونے والی ہیں۔'' وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

انہوں نے یہ سوچا ہوگا کہ ''ان کے جانے کے بعد اس بھری پری دنیا میں سائرہ اکیلی رہ جائے گی اور کوئی اس کا غم خوار نہ ہوگا، شاید اسی لیے انہوں نے مجھے زبردستی عمیر کے ساتھ بھیجا اور اگر میں اب تک عمیر سے روٹھی ہوئی ہوتی تو امی، ابو کے انتقال کے بعد کتنی تنہا ہو جاتی۔''

اس نے گھر کو ایک نظر دیکھا۔ وہ گھر جو امی ابو کی موجودگی میں کیسا بھرا پرا لگتا تھا اب ویران نظر آ رہا تھا، نہ جانے کیوں اس کو پچھلے دن یاد آنے لگے، اس نے یکا یک ایک جھرجھری سی لی، اب اس کو امی کی دانشمندی میں کوئی شک نہ رہا۔

سچ تو یہ ہے کہ اس واقعے کے بعد عمیر کا امی ابو کی تعریف میں رطب اللسان رہنا..... سائرہ کو سراہنا اس کی قربانی کا اعتراف، پھر یہ کہ سائرہ نے اصل معاملے کی امی ابو کو بھنک نہ پڑنے دی، اور عمیر کا بھرم رکھا آخر تک ان کو کچھ معلوم نہ ہوا، اس بات نے بھی عمیر کے دل میں سائرہ کے لیے عزت ومحبت کو دو چند کر دیا تھا، اب سائرہ کی سوچ کتنی بدل گئی تھی کہ بے شک گھر بنانے کے لیے عورت کو قربانی دینی پڑتی ہے، سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے، لیکن آخر کار اس کی بہترین جزا بھی عورت کو ہی ملتی ہے۔

اس نے اپنی آنکھوں کے گوشوں سے نمی صاف کی اور زیر لب مسکرا دی۔

☆.....☆.....☆

اور میں نے سوچا.....

اس دن بھی بلا کا حبس تھا۔

بہاولپور میں گرمیاں بہت شدید ہوتی ہیں اور برسات کے بعد تو ایسا حبس کہ سانس لینا دشوار ہو جائے۔ بیٹھے بیٹھے ہی آدمی پسینے میں شرابور ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی موسم تھا اس دن بھی جب اماں نے گرمی سے پریشان ہو کر کہا تھا۔

''یہاں یہ حال ہے تو پتہ نہیں قبر میں کیا حال ہوگا۔''

ابا جو قریب ہی بیٹھے تھے جھٹ سے بولے۔''جنت کی کھڑکی کھلی ہوگی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آ رہی ہوگی۔''

بس ان کی یہ بات سن کر سوچنے لگی کہ بھلا یہ کیسے کسی شخص کو اتنا یقین اور اعتماد ہو سکتا ہے؟ شاید وہی شخص یہ بات کہہ سکتا ہے جو اللہ کو اتنے قریب سے جانتا ہو کہ اللہ کی مرضی اور اپنی مرضی میں کوئی فرق ہی نہ محسوس کر سکے۔ اور اپنے اعمال کے قبول ہونے کا صرف اس لیے مکمل یقین ہو کہ اللہ کا وعدہ ہے وہ مومنین کی نیکیاں ضائع نہیں کرتا اور اپنے وعدہ کے خلاف بھی نہیں کرتا۔

نیکیوں کے صدور اور انکے بالآخر قبول ہونے کے درمیانی وقت میں تقاضا ہے ڈٹے رہنے کا تو پھر اللہ کبھی اپنے بندے کو مایوس نہیں کرتا۔ نہ دنیا میں نہ قبر میں اور نہ ہی آخرت میں۔ میں جب اپنے ابا کی زندگی پر نظر ڈالتی ہوں تو یہ سادہ سا اصول مجھے پوری شدومد سے انکی زندگی میں دکھائی دیتا ہے اور اسی لئے ابا شاید اس دن بھی اتنے ہی پراعتماد تھے جب قدم قدم پر اللہ نے انہیں بے بس و اکیلا نہیں چھوڑا تو عالم برزخ اور آخرت میں کیونکر ایسا ہوگا! بندہ جب اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو آگ کو ٹھنڈا کرنا ہو، شیر خوار بچے کو دریا کی موجوں سے نکال کر فرعون کے دربار میں پہنچانا ہو، سمندر پھاڑ کر اس میں راستہ بنانا ہو یا تپتے صحرا میں پانی کا چشمہ نکالنا ہو.....اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ ابا کی زندگی کے بعض واقعات نے میری سوچ کو وہ رخ دیا جو آج بھی میرے لئے مشعل راہ ہے۔ ابا کی زبانی ان کے ابتدائی دور کی باتیں سنا کرتی۔ وہ بتاتے تھے کہ جب وہ راتوں کو کھلے آسمان تلے، پلنگ پہ لیٹے، گھنٹوں تاروں کو تکتے رہتے اور غور کرتے کہ یہ عظیم کائنات خود بخود کیونکر قائم ہو سکتی ہے۔ اس غور و خوض کے نتیجے میں وہ اس فیصلے پر تو جلد ہی پہنچ گئے کہ اس کائنات کا وجود بغیر کسی خالق کے ممکن نہیں، لیکن زندگی کن اصولوں پر گزاری جائے اس معاملے میں ان کو راہنمائی کی اشد ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ خوش قسمتی سے ان کے کسی دوست نے ان کو سید مودودیؒ کی کچھ تحریریں لا کر دیں۔ ان تحریروں کا مطالعہ شروع کرتے ہی ایک نئی روشنی ان کی آنکھوں کے سامنے پھیلنا شروع ہو گئی۔ اور انہوں نے باقاعدگی سے سید مودودیؒ کے ماہنامے ترجمان القرآن کا مطالعہ شروع کیا۔ سید مودودیؒ کی جادو اثر تحریریں ان کی عقلی گتھیاں سلجھانے میں بہت مددگار ہوئیں۔ لیکن دل کے اندر ایمانی قوت پیدا کرنے اور اس میں مضبوطی کا کام شاید اللہ تعالیٰ نے اور طریقے سے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ لہٰذا عملی زندگی سے تربیت کا آغاز ہوا۔

اس زمانے میں رُڑکی کالج سے انہوں نے انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ مسلمان ہونے کی بنا پر ہندو اہلکار اور افسران ان سے جلنے لگے اور دوسرے سال کی تربیت مکمل ہونے سے قبل ان کا تبادلہ بدایوں مراد آباد کر دیا جہاں ایک نہایت مردم آزار مسلمان دشمن ایگزیکٹو انجینئر اے وی گپتا تعینات تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ شرارت محض اس لئے کی گئی ہے کہ گپتا صاحب اس قلیل عرصے میں ان کی کارگزاری میں کوئی نہ کوئی عیب نکال دیں تو انہیں فارغ کریں۔ لہٰذا انہوں نے پندرہ دن کی میڈیکل رخصت لے لی اور پندرہ دن کی ایک اور درخواست بھیج دی۔ تب گپتا نے اپنے افسر یعنی S-E کو لکھا کہ یہ شخص یہاں آنا نہیں چاہتا اس لئے جھوٹی درخواستیں بھیج رہا ہے۔ اس پر ایس ای نے ایک سخت خط ان کی طرف بھیجا کہ فوراً ڈیوٹی پر حاضر ہو۔

اب انہوں نے اپنے بعض دوستوں سے مشورہ کیا جنہوں نے رائے دی کہ وہ چیف انجینئر سے ملیں۔ چنانچہ مسٹر اینڈرسن سے ملنے وہ لکھنو پہنچ گئے۔ قیام ایک ہوٹل میں تھا۔ دل میں خوف تھا کہ ایس ای اور X-E-N نے نامعلوم چیف انجینئر کو کیا کچھ لکھا ہوگا۔ رات کو دیر تک وہ اپنے ربِ واحد سے دعائیں کرتے رہے یہاں تک کہ اینڈرسن کی وقعت اب نگاہوں میں بہت گھٹ گئی اور اگلے روز دلیری سے اس سے جا ملے۔ پھر اصل وجہ بلاخوف وجھجک اس کے سامنے رکھ دی کہ مجھے تنگ کرنے کیلئے بلا وجہ بلایا جا رہا ہے۔ آپ میرے دو سال کے کام سے مطمئن ہوں تو جب مجھ کو ملازمت کیلئے بلا لیا جائے ورنہ میں کہیں اور تلاشِ معاش کرلوں گا۔ اینڈرسن نے جواب دیا کہ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو یہی کچھ کرتا۔ اور پھر اس نے مشورہ دیا کہ تم S-E کے حکم کی تعمیل میں مراد آباد تو چلے ہی جاؤ میں S.E کو لکھتا ہوں۔

اب ان کے سامنے مراد آباد جانے اور چیف کی طرف سے کارروائی ہونے تک وہاں رہنا تھا۔ ایک چھوٹے سے باکس میں کھانے پکانے کے کچھ برتن اور سامان لے کر چل دیئے۔ دس بارہ میل پختہ اور چار میل کے قریب کچی سڑک تھی۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ ایس ڈی او صاحب دھوپ میں دفتر جمائے بیٹھے تھے۔ عملہ سب ہندو ہی معلوم ہوتا تھا البتہ ایس ڈی سی جس کا نام محمد فاروق تھا وہ مسلمان تھا۔ تھوڑی بہت امید بندھی کہ اس سے کچھ مدد مل سکے گی۔ لیکن ایس ڈی او صاحب نے بتایا کہ اس کے گھر سے اطلاع آئی ہے بیوی بیمار ہے، اسے چھٹی مل گئی اور وہ سائیکل پر سوار ہو کر جا چکے ہیں۔

اب اس جنگل بیابان میں ایک فکر کھانے پکانے کی تھی کہ آج تک کبھی پکایا ہی نہیں تھا۔ پھر پانی بھرنے برتن دھونے کا سوچ کر ہی خفت محسوس ہو رہی تھی اور فکر بھی کہ ایس ڈی او صاحب کے ساتھ کار میں جائیں تو نماز کا کیا بنے گا۔ بالخصوص عصر کی نماز جو لازماً راستے میں ہی ہو گی کیا وہ کہہ پائیں گے کہ گاڑی روک دیں تاکہ وہ نماز پڑھ سکیں۔ اور اگر وہ نہ مانے تو کیا کار سے اتر جائیں؟''

ان فکروں میں پریشان وہ کچھ دیر خاموش کمرے میں لیٹ گئے۔ آخر ہمت کر کے اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ پانی بھریں، برتن دھو کر پکانے کو رکھیں کہ دروازہ کھلا اور ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکے نے اندر آتے ہوئے کہا کہ کھانا تیار ہے لے آؤں؟ ہائیں یہ کیسا کھانا؟ وہ حیران تھے..... تم کون ہو؟ انہوں نے لڑکے سے پوچھا..... میں ایس ڈی او فاروق کا چھوٹا بھائی ہوں، ان کے ساتھ رہتا ہوں ان کا کھانا وغیرہ پکا دیتا ہوں، وہ مجھ کو پڑھاتے ہیں۔ اب گھر جاتے ہوئے مجھ سے کہہ گئے تھے کہ یہ جو صاحب آئے ہیں ان کے کھانے پینے کا خیال رکھنا۔

پھر کیا تھا کھانا منگوایا، کھایا اور اللہ کا شکر ادا کیا اللہ کا وعدہ یاد آ گیا جو اللہ سے ڈرتے ہیں اللہ ان کے لئے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے وہ گمان بھی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فکر تو دور فرما دی تھی اب دوسری بات رہ گئی تھی۔ سفر میں نماز کی ادائیگی کیونکر ممکن ہوگی؟ اگلے دن ایس ڈی او نے اطلاع دی کہ چیف انجینئر کے خط کی ہدایت پر انہیں فوراً یہاں سے واپس بھیج دیا جائے گا۔ اللہ اکبر! اتنی جلدی چیف انجینئر نے خط لکھ بھی دیا اور آرڈر پاس بھی ہو گئے۔

یہ دونوں واقعات ان کی محبت اللہ تعالیٰ سے بڑھا رہے تھے۔ ان کا ایمان اللہ پر مستحکم سے مستحکم تر ہوتا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی رزّاقی پر ان کا ایمان اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ ایک لمحے کیلئے بھی ان کے دل میں خیال نہ آیا کہ اب کیا ہوگا۔ ان کو پورا پورا یقین تھا کہ اس عالمی کساد بازاری کے ہوتے ہوئے بھی نوکری از خود چل کر ان کے گھر آئے گی۔ اگرچہ تھوڑے بہت پیسے تھے وہ رفتہ رفتہ ختم ہونا شروع ہو گئے اور آخر کار نوبت یہ آ گئی کہ ایک دن جب زوجہ نے سودا سلف کیلئے پیسے لئے تو ان کے پاس بمشکل چند آنے باقی بچے تھے۔ بیوی کو خرچہ دینے کے بعد جیب میں ہاتھ ڈالا تو چند سکے ہی مل سکے جو شاید ایک آدھ دن کی اور سبزی ترکاری کیلئے کافی ہوئے۔ اس وقت دل میں سوچا کہ اب کل تک میری نوکری کا بندوبست اللہ تعالیٰ کو کر دینا چاہیے۔

اگلے دن صبح کے وقت کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جا کر دیکھا تو ڈاکیہ رجسٹری لئے کھڑا تھا۔ اندر آ کر لفافہ کھولا تو سرکاری نوکری کا پروانہ ملا۔ ان کے کہنے کے مطابق اس وقت ان کو جتنی خوشی ہوئی اس سے پہلے ان کو خوشی کبھی نہیں ملی تھی۔ یہ خوشی نوکری ملنے سے زیادہ اس بات پر ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کو مزید آزمائش میں نہ ڈالا اور اپنے عاجز بندے کے دل سے اٹھنے والی خواہش کو قبولیت کا شرف بخشا۔

انہوں نے پاکستان آ کر بہاولپور سے اپنی نوکری کی ابتدا کی۔محکمہ انہار میں ایگزیکٹو انجینئر کی آسامی پر نامزد کر دیئے گئے۔ جہاں جلدی ہی وہ نہ صرف محکمہ میں بلکہ محکمہ کے باہر بھی ایک فرض شناس ایماندار محنتی افسر کے طور پر پہچانے جانے لگے۔ان کی شہرت ایک ایسے افسر کے طور پر تیزی سے کاشتکاروں اور کسانوں میں پھیلنے لگی جو بلا معاوضہ ان کا کام کر دیتا تھا اور جس سے ملاقات کیلئے نہ کسی واسطے کی ضرورت ہوتی اور نہ کسی سفارش کی۔ وہ لوگ جن کی زمینوں کو پانی بلا کسی کوشش اور رشوت کے از خود آسانی سے اپنے حق کی وجہ سے مل جاتا۔ان کو یقین نہ آتا تھا اور اب وہ بطور شکرانہ تحفے لے کر ان کے گھر آنے کی کوشش کرتے تو ان کے ساتھ وہی برتاؤ ہوتا جو رشوت دینے کی کوشش کرنے والوں کے ساتھ ہوتا تھا۔

بدقسمتی سے محکمہ انہار بھی ان محکموں جیسا ہی تھا جس کے ملازمین کی اکثریت بڑے بڑے زمینداروں اور وڈیروں کو اپنی زمینوں اور باغات کیلئے پانی حاصل کرنے کی خاطر دیئے گئے تحفے تحائف اور نقد رقوم کی پیشکش کو ٹھکرانہ پاتی تھی۔ چنانچہ ایس ڈی او سے لے کر چیف انجینئر تک کے گھروں کی شان بالعموم وہی ہوتی جو خدا اور آخرت کی یاد اور جوابدہی کے تصور سے عاری بے خوف غافل گھروں کی ہوتی ہے۔ اس چمکتی دمکتی زندگیوں کے درمیان بسنے والے ایک ایسے گھر کا حال یہ تھا کہ جوان کی ڈائری میں واقعہ سے مکالمے سے شروع ہوتا ہے۔

یہ مکالمہ ایک ایس ای اور اسکی بیوی کے درمیان ہوا۔ جب ان کا تبادلہ قلات ڈویژن بلوچستان سے میانوالی پنجاب کا ہوا تو وہ تمام رقم جو تبادلے کے وقت مل سکتی تھی لے کر روانہ ہوئے۔ان کے پاس اپنا بینک بیلنس تو نہ ہونے کے برابر تھا ایک صوبے سے دوسرے صوبے کے اکاؤنٹس آفس میں جاب کی منتقلی میں کافی وقت لگ جاتا تھا۔ایک صبح وہ دفتر جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے، برابر بیٹھی بیوی نے کہا ''میرے پاس پیسے ختم ہو گئے ہیں۔آج کچھ خرچ کیلئے دیتے جایئے۔''

''پیسہ تو میرے پاس بھی نہیں اور بینک میں بھی اب کچھ باقی نہیں۔''

''تو اب میں کیا کروں؟'' بیوی نے کہا

''تم اللہ سے مانگو۔''

یہ کہہ کر گھر سے ملحق آفس میں جا بیٹھے۔اتنے میں ڈاکیہ آیا 200 روپے کا منی آرڈر بھائی یوسف علی خان نے ان کو بھجوایا تھا۔ بیوی کو اطلاع دی کہ پیسے آ گئے ہیں۔ چپڑاسی کو بھیج دو کہ بازار سے سودا سلف لے آئے۔ یہ دو سو روپیہ بھی کوئی بڑی چیز نہ تھی۔Pay Slip آج آتی ہے نہ کل، یہ پونجی بھی ختم کے قریب ہے۔ایک روز بخار آ گیا، دفتر نہیں گئے، گھر پہ آرام کر رہے تھے کہ اطلاع دی گئی کہ کالا باغ کے بینک منیجر صدیقی صاحب آئے ہیں اور ملنا چاہتے ہیں کہا کہ سلام کہہ دو کہ آج طبیعت خراب ہے پھر کسی دن ملاقات ہو جائے گی۔ جواب آیا کہ منیجر صاحب کہتے ہیں I must see him۔

منیجر صاحب کو ملاقاتی کمرے میں بٹھایا گیا۔ دو ایک باتیں کر کے کہنے لگے، آپ کا بینک بیلنس تو کچھ دن ہوئے ختم ہو گیا۔اب آپ کو تو خرچ کی تکلیف ہو گی۔نہیں کوئی بات نہیں۔کام چل رہا ہے۔ جواب دیا گیا۔منیجر صاحب نے کہا آپ تکلیف نہ اٹھائیں۔آپ اوڈرافٹ جاری کر دیں وہ میں کیش کرا دوں گا۔

چنانچہ کسی سے قرض یا ادھار لینے کی نوبت آئے بغیر کام چلنے لگا یہاں تک کہ Pay Slip آ گئی۔

یہ اس طرح کے واقعات اس لئے رونما ہوتے ہیں کہ انسان اپنے رب کو پہچان سکے۔ روزانہ کے لگے بندھے راستے سے ہٹ کر ربوبیت کا انتظام شان ربوبیت کو نمایاں کرنے کیلئے ہوتا ہے۔

درویشوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ طمع نہیں کرتے جمع نہیں کرتے اور منع نہیں کرتے۔ میرے ماں باپ کی زندگیوں میں یہ تینوں خصوصیات موجود تھیں۔ایسے اللہ والوں کی زندگی تو شاید کبھی حُبس کا شکار ہوئی ہو۔لیکن ان کو ہمیشہ یہ یقین رہا کہ دنیا چھوڑنے کے بعد اللہ جنت کی کھڑکی کھول دے گا۔ یوں ایمان بالغیب کو عین الیقین ہونے میں بہت قریب سے دیکھا تو سوچنے لگی کہ آخر یہ توکل پیدا کیسے ہوتا ہے، اور اپنے والد کے اس مختصر سے جواب نے میری زندگی کی راہیں ہمیشہ کیلئے روشن کر دیں کہ:

''جب بندہ دانستہ اللہ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچائے رکھے۔''

☆.....☆.....☆

آسیہ راشد

مجھے ہے حکمِ اذاں.....

محترمہ ناصرہ الیاس صاحبہ

باوقار، بردبار، باہمت، باحوصلہ بانی الخدمت ٹرسٹ (ویمن ونگ) محترمہ ناصرہ الیاس صاحبہ جماعت اسلامی کا وہ بلند و بالا ستون ہیں جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ آپ کا تعلق چنیوٹ کے کاروباری گھرانے سے ہے۔ ان کی برادری کے بہت سے لوگ انسانی قابلیت کے بلند معیار کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو عنایات کیں ان کے شکرانے کے طور پر اپنی زندگی کو جسمانی و مالی جہاد کیلئے وقف کر دیا۔ ان کی مساعی جمیلہ سے پاکستان کے صحراؤں اور بیابانوں میں اذانیں گونجنے لگیں۔ بہت سے بے سہاروں کو سہارا ملا۔ بے شمار بچے بچیاں ''اقراء'' سے روشناس ہوئے۔ ان کے فلاحی کام صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کیلئے ہیں۔ جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع نومبر 2014ء میں ان کی خدمات کے اعتراف اور ''بانی الخدمت'' کے طور پر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ آیئے ان قابلِ قدر خاتون سے ملتے ہیں۔

س: آپ کا نام اور تاریخ پیدائش؟

ج: ناصرہ الیاس نام ہے جب پاکستان بنا تب میری عمر چار برس تھی یعنی میں 1943ء کی پیدائش ہوں۔

س: آپ کہاں پیدا ہوئیں اور اپنے خاندان کے بارے میں بتائیں؟

ج: میں کلکتہ میں پیدا ہوئی۔ میرا تعلق چنیوٹ برادری سے ہے۔ تقسیم سے پہلے تمام لوگ کلکتہ میں کاروبار کرتے تھے۔ ہماری برادری کے تمام تاجر اپنی محنت، کاروباری فطانت اور محتاط رویوں کے سبب پچھلے دو سو سال سے برصغیر کی تجارت میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ چھوٹی عمر کی شادیاں، بزرگوں کا احترام، انتہائی منظّم طور پر ایک دوسرے سے پیوستہ خانگی زندگیاں ہماری برادری کی شناخت ہے۔ پاکستان بننے کے بعد ہم لوگ فیصل آباد آ گئے یہاں میرے دادا میاں حاجی مولا بخش نے ''نشاط مل'' کی بنیاد رکھی۔ جو ان کی آخری آرام گاہ بھی ہے۔ میرے والد چھ بھائی تھے سبھی اس کاروبار میں شامل تھے۔ ''نشاط فیصل آباد انجینئرنگ'' ''نشاط جوٹ'' کی بنیاد وہیں پڑی۔ نشاط مل میرے والد صاحب کی تھی۔ پاکستان کا ایک بڑا کاروباری نام میاں منشا میرے چچازاد بھائی ہیں۔

س: آپ نے تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

ج: میں نے فیصل آباد سے میٹرک کیا ہے۔

س: آپ کے کتنے بہن بھائی ہیں؟

ج: ہم کل آٹھ بہن بھائی ہیں۔ چار بھائی اور چار بہنیں۔ رضیہ، ناصرہ، یاسمین، سلیم، فریدہ انیس اور بھائی محمد وسیع، محمد نسیم، ریاض احمد اور ارشد جمیل سبھی کاروبار سے منسلک ہیں۔

س: آپ کے گھر کا ماحول کیسا ہے؟

ج: ہمارے گھر کا دینی ماحول تھا ہمارے خاندان میں سبھی کا خدمتِ خلق کی طرف رجحان تھا میرے دادا خصوصی طور پر اس کام میں دلچسپی رکھتے تھے۔ درویش منش انسان تھے۔ بے ریا زندگی تھی۔ مزدوروں کے ساتھ زمین پر بھی بیٹھ جاتے۔ اس میں کوئی عار محسوس نہ کرتے سادہ لباس پہنتے، سادہ خوراک کھاتے۔ انہوں نے چنیوٹ کا اسلامیہ کالج اور چنیوٹ کا مدرسۃ البنات بنوایا۔ میرے والد ان کے ساتھ ساتھ رہتے۔ امی بچیوں کو ترجمہ قرآن پڑھاتیں۔ میرے خالو امین سہگل نے عمر حیات کی بلڈنگ میں چنیوٹ کا یتیم خانہ بنوایا جہاں بے شمار بچوں نے تعلیم حاصل کی اور انہیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بنایا۔ میری والدہ کو کچی بستیوں میں جا کر غرباء کو کھانا کھلانے کا بھی بہت شوق تھا۔ ہم نے خدمت خلق کی تعلیم وراثت میں حاصل کی۔

س: چنیوٹ میں عمر حیات کی بلڈنگ کی کیا کہانی ہے؟

ج: چنیوٹ برادری کے ایک فرد عمر حیات نے 1922ء میں ''گلزار محل'' تعمیر کروانا شروع کیا۔ 14 مرلے زمین پر پانچ منزلہ یہ عمارت شان وشوکت، اورفنِ تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ ابھی یہ محل مکمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ عمر حیات کا انتقال ہوگیا۔ شوہر کی موت کے بعد عمر حیات کی بیوہ اور اکلوتے بیٹے گلزار کی زندگی تاریک ہوگئی۔ عمر حیات کی بیوہی نے کچھ ہی عرصہ بعد اپنے بیٹے کی شادی کا اہتمام کیا۔ گلزار محل کو پوری طرح سجایا گیا۔ شادی کے اگلے روز یعنی ولیمے والے دن گھر کے مکینوں پر ایک قیامت کا سماں برپا ہوگیا۔ دلہا گلزار محل میں مردہ حالت میں پایا گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ اسے سانپ نے کاٹ لیا اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ غسل خانے میں نصب حمام میں دم گھٹنے سے ہلاک ہو گیا۔ بیوہ ماں نے محل کے دالان میں ہی بیٹے کو دفن کروا دیا۔ بیٹے کی موت کے ایک سال بعد بیوہ ماں بھی چل بسیں۔ ان کی قبر بھی اسی محل میں بیٹے کے پہلو میں ہے۔ ایک صدی گزرنے کے بعد بھی اس گھر کے نقش ونگار، شیشے اور مینا کاری اسی طرح چمک دمک رہی ہیں جیسے آج ہی بنے ہوں۔ عمر حیات کے ورثاء نے اس گھر کو منحوس قرار دے کر وہاں رہنے سے انکار کر دیا۔ پھر اس وقت میرے خالو امین سہگل جو چنیوٹ شہر کے مخیّر حضرات میں سے تھے نے وہاں یتیم خانے اور سکول کی بنیاد رکھی۔ جو بچے یہاں تعلیم حاصل کرتے اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر نکلتے۔ بہت سے بچے ایئر فورس اور سول سروس میں بھی گئے اور سوسائٹی کے معتبر رکن بن کر نکلے۔ اب یہاں لائبریری بن چکی ہے۔

س: اپنی زندگی کا کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ بتائیں؟

ج: یہ واقعہ میرے والد صاحب کے ساتھ پیش آیا۔ ان دنوں نواب شاہ میں ہماری فیکٹری اور گھر ساتھ ساتھ تھے۔ میرے والد فجر کی نماز پڑھ کر گھر واپس آ رہے تھے اس وقت دھندلکا سا تھا انہیں ٹھوکر لگی نیچے دیکھا تو ایک بچہ ٹاٹ اوڑھ کر سو رہا تھا۔ ٹھوکر لگنے سے وہ اُٹھ گیا۔ انہوں نے نام پوچھا تو بولا ''شفیع'' والد صاحب کا نام بھی شفیع تھا۔ انہوں نے اس سے سرِ راہ سونے کا سبب پوچھا تو بولا سوتیلے رشتہ داروں نے گھر سے نکال دیا ہے۔ میں آپ کی فیکٹری میں روئی کی گانٹھوں پر نمبر لگاتا ہوں اس سے جو پیسے ملتے ہیں ان کا کھانا کھا لیتا ہوں۔ سونے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے جہاں جگہ ملے وہیں سو جاتا ہوں۔ والد صاحب اسے گھر لے آئے اسے کھانا دیا۔ امی نے اسے اپنے پاس رکھا۔ کچھ دنوں بعد اسے خالو جان کے بنوائے ہوئے چنیوٹ کے یتیم خانے میں بھیج دیا اور پڑھوایا۔ میٹرک کے بعد اس نے بی اے ایل ایل بی کیا بعد میں وہ بچہ کوئٹہ کی عدالت کا جج بنا۔ جج بننے کے بعد اس نے میرے والد صاحب کو کوئٹہ سے خط لکھا کہ جس بچے کو آپ نے سڑک سے اُٹھایا پڑھوایا آج وہ کوئٹہ کی عدالت کا جج ہے۔ اگر ہمارے صاحب حیثیت لوگوں کی ہر فیملی ایک ایک بچے کی کفالت کرے تو کتنے لوگ علم حاصل کر پائیں گے۔ اور معاشرہ سدھر جائے گا۔

س: اپنی شادی اور بچوں کے بارے میں بتائیں؟

ج: میرے سسرال والوں کا تعلق کراچی سے ہے۔ میاں الیاس صاحب کیمیکل کا کاروبار کرتے ہیں۔ کراچی لاہور چائنہ میں ہمارا کاروبار ہے۔ میرے آٹھ بچے ہیں۔ جب تین بچے تھے تب جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی تب مولانا مودودیؒ کی کتاب ''ضبط ولادت'' پڑھی اور باقی پانچ بچے بعد میں پیدا ہوئے۔ ایک بیٹا ڈاکٹر ہے جو کینیڈا میں ہے باقی تین بیٹے میرے ساتھ ہیں۔ بڑی بیٹی افشاں لاہور میں ہے جو میری بڑی آپا رضیہ کی بہو ہے دوسری بیٹی عائشہ سعید نویدہ انیس کی بہو ہے دونوں الخدمت میں کام کر رہی ہیں۔ آمنہ میرے بھائی کی بہو ہے۔ وہ کینیڈا میں رہتی ہے اور مانٹریال کی ناظمہ ہے ڈاکٹر بیٹا پرنس جارج کینیڈا میں نیوروسپیشلسٹ ہے بیوی ثمرین عامر کینیڈا کی ریلیجن کمیٹی ''اکنا'' ''Icna'' کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ اور بیٹی سائرہ کراچی میں میرے ساتھ ہوتی ہے۔

س: جماعت اسلامی سے تعارف کیسے حاصل ہوا؟

ج: میرے والد میاں محمد شفیع صاحب دینی سوچ کے حامل تھے وہ جماعت اسلامی کا پرچہ ترجمان القرآن شوق سے پڑھا کرتے تھے اور مولانا مودودیؒ سے بہت متاثر تھے۔ ان کا تمام کاروبار بینک کے

قرضوں سے چلتا تھا۔ جس میں سود کا لین دین تھا وہ اس معاملے میں بہت پریشان رہتے جب میرے والد صاحب نے چچاؤں سے مل کر نشاط فیصل آباد اور نشاط جوٹ بنانی شروع کی تو اس کیلئے بینکوں سے قرض لیا۔ میرے والد صاحب سودی پیسہ نہیں لینا چاہتے تھے۔ مگر تمام چچا اس پر رضامند نہ ہوئے جس کی وجہ سے والد صاحب پریشان رہنا شروع ہو گئے کہ کیسے سود سے جان چھڑوائیں۔ آخر مشورے کیلئے ہم مولانا مودودیؒ سے ملنے (ان کی رہائش گاہ اچھرہ میں واقع ہے) چلے گئے۔ ہم ان کی بیگم سے بھی ملے۔ مولانا نے مشورہ دیا کہ آپ بتدریج اس کام سے اپنا پیچھا چھڑائیں قرضے لینے بند کر دیں۔ مزید سود نہ دیں۔ آپ یہ سمجھیں کہ آپ باکراہت اسے کر رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ آپ سودی کاروبار سے نکل آئیں گے۔

س: آپ نے پہلا فلاحی کام کب کیا؟

ج: میں نے پہلا فلاحی کام 1965ء میں کیا جب پاک بھارت جنگ ہو رہی تھی۔ ان دنوں اپیل آ رہی تھی کہ بارڈر پر بھیجنے کیلئے لحاف، کمبل، سوئٹر چاہئیں۔ میں نے اپنے گھر میں نٹنگ مشینیں لگوائیں اور سوئٹر تیار کروائے، لحاف سلوائے، کمبل خریدے۔ اب مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ بارڈر پر کیسے پہنچائیں۔ کون ایسے ایماندار لوگ ہوں گے جو یہ سارا سامان بحفاظت بارڈر پر پہنچا دیں۔ کسی نے کہا جماعت اسلامی ایسے کام بہت اچھی طرح کرتی ہے آپ اُن سے رابطہ کریں۔ آرام باغ میں جماعت اسلامی کا دفتر تھا رجب علی صاحب ان کے منتظم تھے میں نے ان کا دفتر ڈھونڈا وہ بلڈنگ کی اوپری منزل پر تھا وہ نیچے اترے، انہیں بتایا اور گھر کا پتہ دیا گھر کا پورا لان سامان سے بھرا پڑا تھا۔ وہ میرے گھر آئے اور سارا سامان لے گئے یہ میرا سب سے پہلا ویلفیئر کام تھا۔

س: جماعت اسلامی میں شمولیت کب اختیار کی؟

ج: میں دنیا کی دلچسپیوں میں مگن تھی۔ اچھا پہننا اوڑھنا گھر کی تزئین و آرائش ہی میری زندگی کا محور و مقصد تھا۔ میرے پاس دنیا کی ہر نعمت تھی۔ مگر ساتھ ہی ذہن میں بہت سی الجھنیں بھی تھیں۔ زندگی مطمئن نہیں تھی۔ ذہن خلفشار کا شکار رہتا تھا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتی یا اللہ مجھے دین والے لوگوں سے ملوا دے۔ 1967ء میں میں نے حج کیا اور حج کے موقع پر بھی میں نے یہی دعائیں کیں کہ مجھے سیدھے راستے پر چلنے والے لوگوں سے ملوا دے۔ 1967ء سے 1970ء تک میں اللہ تعالیٰ سے یہی دعائیں کرتی رہی۔ پھر میں نے مولانا مودودیؒ سے خط و کتابت شروع کر دی۔ پردے کے معاملات میں مجھے راہنمائی درکار تھی۔ کبھی تو مولانا خود جواب دیتے اور کبھی ان کے سیکرٹری فقیر حسین صاحب کی طرف سے جواب آتا پھر مولانا نے مجھ سے کہا آپ جماعتِ اسلامی کی ویمن ونگ کی سربراہ آپا ام زبیر سے ملیں۔ ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ جماعت اسلامی افراد کو ڈھونڈتی ہے لیکن میں نے جماعتِ اسلامی کو ڈھونڈا۔ یہ 1970ء کی بات ہے جب میں اپنی والدہ کے ہمراہ آپا ام زبیر سے ملنے گئی۔ وہاں میری ملاقات بلقیس آپا، فیض آپا سے ہوئی بعد میں ہم سب نے مل کر بہت کام کیا۔ جب میں لاہور آئی تو آپا زبیدہ بلوچ سے بھی ملاقات رہی۔ 1976ء تک میں نے بحیثیت کارکن کام کیا اور بعد میں رکنیت اختیار کی۔

س: الخدمت بنانے کا خیال آپ کو کیسے آیا؟

ج: میں بحیثیت کارکن آپا ام زبیر کی ہدایت کے مطابق فلاحی کام کرتی رہتی تھی ان دنوں ہم طارق روڈ والے گھر میں رہتے تھے۔ یہ گھر تین سو گز کا تھا اب وہاں مارکیٹ بن گئی ہے۔ فلاحی کام کا آغاز تو 1965ء میں ہو چکا تھا اور اسی گھر سے ہوا تھا۔ ہم اس گھر میں پروگرام کرتے درس قرآن ہوتا ہماری برادری کی بہت سی خواتین درسِ قرآن میں شامل ہوتیں۔ پروگرام کے بعد ہم لوگوں سے اپیل کرتے اور لوگ ہم پر اعتماد کرتے یوں لوگوں کے گھروں سے سامان آنا شروع ہو گیا۔ اب یہ ہوا کہ جگہ کم پڑ گئی اور سامان زیادہ اکٹھا ہو گیا۔ ٹیکسٹائل انڈسٹری کی بیگمات نے بہت زیادہ فنڈز دینے شروع کیے۔ فیض آپا اور بلقیس آپا الحمرا میں درس رکھتے پھر اپیل کرتے تو لوگ فوراً فنڈز دے دیتے۔ الخدمت فاؤنڈیشن کا مردانہ شعبہ پہلے سے بھی موجود تھا۔ 1984ء میں سابق قیمہ جماعتِ اسلامی عائشہ منور صاحبہ نے خواتین کا شعبہ الخدمت بنایا اور اسے علیحدہ ٹرسٹ کی شکل دے دی گئی اور مجھے اس کا ذمہ دار بنا دیا گیا۔ برس ہا

برس میرا گھر الخدمت کا مرکز رہا دو گھروں کا ایک گھر بنایا۔ ساتھ والا پلاٹ لے کر وہاں ایک گھر خدمتِ خلق کیلئے مختص کر دیا۔ پھر مجھے ہدایت ہوئی کہ اسے دوسرے شہروں میں متعارف کرواؤ اور وہاں بھی کام کرو۔ یوں فیصل آباد، کراچی، لاہور، اسلام آباد، حیدرآباد پانچ شہروں میں الخدمت ٹرسٹ خواتین کو منظّم کیا گیا۔ 90ء میں باقاعدہ رجسٹر کروایا گیا اور اسے مردانہ نظم سے علیحدہ کر دیا گیا۔

س: الخدمت ٹرسٹ کے کتنے شعبے ہیں؟

ج: الخدمت کے بہت سے شعبے ہیں جن میں عوام الناس کی خدمت کیلئے علاج، تعلیم، شادی بکس، کفایت یتٰمی، روزگار، آفات میں امداد، فراہمی آب، سماجی خدمات، بین الاقوامی امداد اور اب حرم فورم کا آغاز کر دیا گیا ہے۔

علاج:۔ (MCHC) Mother + Child health care centre کے نام سے پاکستان کے پسماندہ ترین اور طبی سہولیات سے محروم تھر پارکر میں ہسپتال قائم کیا گیا ہے تا کہ وہاں کے رہائشی اور ارد گرد کے علاقوں کو علاج کی سہولت میسر ہو۔ بہت سی کچی آبادیوں میں میڈیکل کیمپس کے ذریعے حفاظتی ٹیکے اور مفت طبی امداد دی جاتی ہے اس وقت پورے ملک میں چھ بڑے کلینک بیس میڈیکل کیمپ کام کر رہے ہیں ان کیمپوں میں تقریباً انتیس ہزار پانچ سو مریضوں کا مفت علاج ہو رہا ہے۔

تعلیم و تربیت

مثالی مسلم معاشرہ اور ترقی یافتہ محبّ وطن قوم کی بنیاد بنانے کیلئے ہمارا یہ شعبہ بہترین کام کر رہا ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ متاثرہ خواتین کی کونسلنگ کے ذریعے ان میں بندگی رب کا شعور اور اعتماد پیدا کر کے ان کی تربیت کی جاتی ہے۔ اس وقت تعلیمی اداروں کی تعداد 56 ہے جن میں 14 ہزار 6 سو 92 طلبہ و طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

روزگار

خواتین کیلئے محفوظ اور باعزت روزگار کی فراہمی کیلئے ہمارے فلاحی مرکز قائم ہیں۔ خواتین کو فنی تعلیم کے ڈپلومہ کورس کروائے جاتے ہیں تا کہ وہ اپنا روزگار باعزت طور پر خود کما سکیں۔ کورس پاس کرنے والی خاتون کو ڈپلومہ سرٹیفکیٹ کے ساتھ سلائی مشین دی جاتی ہے تا کہ وہ اپنی فیملی کی معاون و مددگار بن سکیں۔ کمپیوٹر کی تعلیم فراہم کرنا مستقبل کا منصوبہ ہے۔ اس وقت فلاحی مرکز اور سلائی سینٹرز کی تعداد 34 ہے اور سلامی مشینیں 6 سو 83 ہیں۔ جن پر 9 ہزار 4 سو 34 (9434) خواتین کام کر رہی ہیں۔

شادی بکس

مہنگائی کے اس دور میں ایک نئی زندگی کے آغاز کیلئے نو بیاہتا جوڑے کو بنیادی ضروریات زندگی کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔ تحقیق کے بعد جوڑے کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے شادی بکس کی درجہ بندی کی جاتی ہے۔ ناگہانی آفات سے متاثرہ پناہ گزینوں کیلئے اجتماعی شادیوں کا اہتمام کیا جاتا ہے ہم اب تک 15 سو شادیوں میں معاونت کر چکے ہیں جن پر 75 لاکھ 3 ہزار 5 سو 27 کے اخراجات آئے ہیں۔

ناگہانی آفات

آسمانی و زمینی آفات یا دہشت گردی کے نتیجے میں ہونے والی تباہ کاری سے متاثرہ خاندانوں کیلئے نقد اور اشیاء کی صورت میں معاونت کیلئے الخدمت خواتین نے ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دور دراز متاثرہ علاقوں تک ٹرکوں کے ذریعے ریلیف پیکیج جن میں خیمے، راشن، برتن، لباس، چٹائیاں، ادویات اور دیگر ضروریات زندگی کا سامان روانہ کیا جاتا ہے آج کل ہم آئی ڈی پیز کی مدد کر رہے ہیں۔ اب تک ہم چار ہزار ایک سو اڑسٹھ خاندانوں کی معاونت کر چکے ہیں۔

سماجی خدمات

مہنگائی اور بے روزگاری کے ستائے ہوئے خاندانوں میں راشن کی فراہمی، لباس اور رمضان المبارک میں خصوصی راشن، پیکیج عید الاضحیٰ پر غرباء میں قربانی کے گوشت کی تقسیم، سردی میں لحاف کی تقسیم، امدادی سستے بازار ہماری سماجی خدمات میں شامل ہیں۔

فراہمی آب

ملک کی شہری آبادیوں سے دور دراز بے آب و گیاہ علاقوں میں

صاف پانی کیلئے کنواں کھدائی، پمپ، نلکے، کولر، ہینڈ پمپ، بورنگ وغیرہ سے پانی فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے بالخصوص بلوچستان اور تھر میں پانی کی فراہمی کیلئے بڑے پیمانے پر کام جاری ہے۔

کفالتِ یتامیٰ

پاکستانی معاشرے کا سب سے زیادہ متاثرہ اور معاونت کا مستحق فرد ایک یتیم بچی ہے کفالت یتامیٰ پروجیکٹ کے ذریعے بچیوں کو یونیفارم، کتب اور ان کے گھروں پر کفالت کے وظائف پہنچائے جاتے ہیں۔ یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے والے کو اس کے سر کے بالوں کے برابر گناہوں کی معافی کی نوید حضورؐ نے سنائی ہے۔ ہم الحمدللہ ایک سو پچیس یتیم بچیوں کی کفالت کر رہے ہیں۔

بین الاقوامی امداد

ہمارے پیارے نبیؐ کا فرمان ہے کہ امت مسلمہ جسد واحد کی طرح ہے۔ ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم درد محسوس کرتا ہے۔ اس کے مصداق ہم تمام امت مسلمہ کی ضرورت کے وقت مدد کیلئے کمر بستہ رہتے ہیں۔ بین الاقوامی امداد کی دو صورتیں ہمارے ادارے میں روبعمل ہیں۔

۱۔ مسلمان ممالک کے مسلمان مہاجرین۔

۲۔ الخدمت فاؤنڈیشن کے ذریعے بیرون ملک نقد امداد کی فراہمی۔

مہاجرین کی ایک بڑی آبادی کراچی کی ساحلی پٹی پر ''ارکان آباد'' کے نام سے آباد ہے۔ جہاں پر الخدمت خواتین پاکستان مختلف حوالوں سے علاج دینی و دنیوی تعلیم، راشن کی تقسیم، لباس کی فراہمی وغیرہ میں امداد کر رہی ہے۔

ہمارے شعبے نے اورنگی ٹاؤن میں 11 نمبر سیکٹر میں پلاٹ خرید کر سینکڑوں کی تعداد میں گھر بنا کر مہاجر لوگوں کو دیئے جو ''بہاری کالونی'' کہلاتی ہے۔ ''گوشہ عافیت'' غریب اور بے سہارا لوگوں کیلئے بہترین پناہ گاہ ہے۔ جماعت اسلامی زندگی کے ہر ہر شعبے میں کام کر رہی ہے۔ ہم پر لوگ پورا اعتماد رکھتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے امداد دیتے ہیں۔ بیرون ملک، انگلینڈ، سعودی عرب امریکہ وغیرہ سے لوگ بے شمار امداد بھیجتے ہیں۔

س: لوگ خدمت خلق کے کاموں میں حصہ ڈالنے کیلئے کیسے آمادہ ہوتے ہیں؟

ج: ہماری چنیوٹ برادری میں لوگ اپنے لباس پر بے تحاشا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ ہم ان کی تربیت کرتے ہوئے انہیں بتاتے ہیں کہ یہ دنیا فانی ہے سب کچھ یہاں رہ جانا ہے انہیں آخرت کا خوف اور جوابدہی کا احساس دلایا جاتا ہے کہ یقیناً اس روز ہر نعمت کا حساب دینا پڑے گا ایک ایک جوڑے پر لاکھوں خرچ کر دیتے ہو لاکھ ڈیڑھ لاکھ کے جوڑے کے بجائے پچاس ہزار کا جوڑا بنالو۔ باقی اللہ کی راہ میں دے دو جو دو گے وہی تمہارا اصل مال ہے۔ اللہ کا شکر ہے لوگ بات کو سمجھ جاتے ہیں۔ جس مد میں لوگ دیتے ہیں ہم اسی میں خرچ کرتے ہیں کچھ لوگ انسانیت کیلئے کام کرتے ہیں مگر میں سمجھتی ہوں جو کام خالصتاً للہ نہ ہو وہ کام درست نہیں ہوتا۔

س: آپ نے حرم فورم کا آغاز کیا اس کے بارے میں بتائیں؟

ج: حرم فورم کے نام سے عازمین حج کی تربیت کی جاتی ہے۔ ملک کے مختلف مقامات اور مراکز حرم فورم میں پرائیویٹ گروپس کے ساتھ جانے والوں کی تربیت گاہوں کا انعقاد کیا جاتا ہے تاکہ عازمین حج کے مقاصد اور روح کو سمجھتے ہوئے بہتر طریقہ سے فریضہ حج ادا کر سکیں۔

س: آپ نے جب الخدمت کے کام کا آغاز کیا تو گھر اور باہر کے کاموں کو کیسے ساتھ لے کر چلتی رہیں؟

ج: جب میں نے الخدمت کا کام شروع کیا تو سب خاندان والوں نے شدید مخالفت کی۔ تمام رشتہ دار میرے مخالف ہو گئے کہ بچے چھوڑ کر باہر کے کاموں میں مصروف ہو گئی ہو۔ میری بہنیں جو میرے کام کرنے کے خلاف تھیں آج وہی میرے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ شروع شروع میں جب بچے چھوٹے تھے انہیں کبھی میں ساتھ لے جاتی کبھی نوکروں کی سہولت ہوتی تو گھر چھوڑ دیتی۔ گھر میں ساس سسر نند دیور سبھی کی ذمہ داری مجھ پر تھی اللہ کا شکر ہے سبھی ذمہ داریوں کو بطریقِ احسن

نبھایا۔ جماعتی کاموں کیلئے وقت تو نکالنا پڑتا ہے۔

س: آپ پر اتنے لوگ اعتماد کر کے پیسے دیتے ہیں۔ لوگوں پر خرچ کرتے ہوئے کبھی دھوکے باز بھی ملے ہوں گے؟

ج: ہم تحقیقات کے بغیر کسی کو ذمہ دار نہیں بناتے۔ یہ لوگوں کی امانتیں ہیں لہٰذا ہم تصدیق کے بغیر کسی کی امداد بھی نہیں کرتے لوگ جس مد کیلئے رقم دیتے ہیں ہم اسی مد میں خرچ کرتے ہیں۔

س: پاکستان کے پسماندہ علاقے جیسے سندھ کا علاقہ تھر اور بلوچستان کے علاقوں میں کام کی تھوڑی تفصیل بتائیں؟

ج: ان علاقوں میں بہت غربت ہے پانی کی بے حد کمی ہے ہم جس علاقے میں کام کرنے جاتے ہیں وہاں کنویں کھدواتے ہیں۔ بلوچستان کے علاقہ ''لسبیلہ'' میں ہمارا دعوتی کام بہت ہو رہا ہے وہاں کی ایک عورت میرے پاس آئی اور کہنے لگی اللہ نے آپ کو اتنا دیا ہے آپ ہمارے لئے کچھ کریں۔ ہمارے پاس پانی نہیں ہے مسجد نہیں ہے۔ آپ کنواں کھدوا دیں مسجد بنوا دیں۔ وہ بہت زیادہ ریتلا علاقہ تھا بڑی بڑی جھاڑیاں تھیں اتنا بڑا بڑا کالا بچھو جو بہت زہریلا ہوتا ہے اس علاقے میں پایا جاتا ہے وہاں کام کرنا از حد مشکل تھا اس بچھو کے کاٹنے سے بندہ مر جاتا ہے میں نے اس علاقے میں کام کیا اور مسجد بنوائی۔ ان پیسوں کا انتظام بھی حیرت انگیز طور پر ہوا۔ طارق روڈ والے گھر میں میری ایک ہمسائی تھی اس کا نام رخشندہ تھا اس کی شادی ہوئی اور طلاق ہوگئی وہ واپس والدین کے گھر آ گئی۔ وہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی میں سٹی سکول میں پڑھاتی ہوں میرا یہ زیور لے لیں اس کی مالیت ساٹھ ستر ہزار روپے ہے اسے کسی رفاہی کام میں لگا دیں میں نے اس کے پیسوں سے وہاں مسجد بنوائی جب مسجد بن گئی تو میں اسے وہاں لے کر گئی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ ''کھاری ناکہ'' ''حب'' سے آگے کا علاقہ ہے جہاں مسجد کی تعمیر ہوئی۔ اس کے بعد مختلف گوٹھوں سے درخواستیں آنے لگیں کہ ہمیں کنویں کھدوا دیں۔ احمد بخش گوٹھ، صدیق گوٹھ، سوری گوٹھ، سومیاں، وندر میں ہم نے کنویں کھدوائے۔ اوتھل کی بلوچی خاتون نے ہمیں زمین دلوا دی۔ اس کے پلاٹ پر ہم نے مدرسہ بنوایا ہے۔ یہاں اڑھائی سو بچے بچیاں پڑھ رہے ہیں صبح سے شام چار پانچ بجے تک کلاسیں ہوتی ہیں اس وقت ہم آٹھ مسجدیں اور دس مدرسے بنوا چکے ہیں۔ منصورہ ہالہ جسے دوسرا منصورہ کہتے ہیں وہاں مسجدیں اور مدرسے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں وہاں بڑی تعداد میں بچے پڑھ رہے ہیں اسے جماعتِ اسلامی کے رکن جان محمد بھٹو صاحب نے بنایا تھا۔ وہاں لڑکیوں کے مدرسے کیلئے درخواست دے رکھی ہے۔

س: آپ آج کل کس پراجیکٹ پر کام کر رہی ہیں؟

ج: میں آج کل وندر میں ایک وسیع پراجیکٹ پر کام کر رہی ہوں۔ محمد بخش صاحب بلوچی ہیں ان کی ایک ٹریول ایجنسی ہے۔ انہوں نے چوبیس سو گز کا پلاٹ دیا ہے جس کی مالیت ایک کروڑ ستر لاکھ روپے ہے یہاں پوری جامعہ بن رہی ہے۔ ہاسٹل بھی ہوگا، چالیس لاکھ کے قریب خرچ ہو چکا ہے۔ میرے بہنوئی محمد سلیم جو بھیرہ ٹیکسٹائل مل کے مالک ہیں انہوں نے وندر میں عمر نور مسجد بنوائی جس کے ساتھ مدرسہ بھی ہے یہ مسجد ان کے والد کے نام پر ہے۔ انہوں نے پینتیس لاکھ روپیہ دیا۔ اس مسجد کے ایک کونے میں لڑکیوں کی تعلیم کا کام شروع ہو چکا ہے۔ انشاء اللہ اسی سال افتتاح ہو جائے گا۔ میں خود وہاں جا کر اپنی نگرانی میں تمام کام کرواتی ہوں۔ میں صبح جاتی ہوں اور عشاء تک واپس آ جاتی ہوں یہ پراجیکٹ میرے گھر سے دو سو میل کے فاصلے پر ہے یہاں پر ہم نے کنواں بھی کھدوا دیا جس کا پانی بہت کھاری تھا ہم نے پیا تو وہ نمک سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے انہیں کہا پانی نکالتے جاؤ اب ایک سال کی محنت شاقہ کے بعد صاف پانی آنے لگا ہے۔ کوئٹہ کے مین روڈ پر مسجد کی تعمیر اور پانی کی فراہمی کا کام بھی جاری ہے۔

س: ایک کنویں پر کتنی لاگت آتی ہے؟

ج: ایک کنویں کی کھدائی میں چار لاکھ تک لاگت آتی ہے۔

س: کیا الخدمت جماعت کے اور شعبوں میں بھی کام کرتی ہے؟

ج: جی ہاں الخدمت کا ہر شعبے میں حصہ ہوتا ہے جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع کے موقع پر تمام باتھ روم میں نے بنوائے تھے اتنی بھاگ دوڑ کا کام تھا کہ میرے پاؤں کے تمام ناخن ٹوٹ گئے۔ بیٹھک

سکول بھی الخدمت چلا رہا ہے نگران فریدہ جمیل ہیں۔ فنڈ الخدمت والے دیتے ہیں متبادل ہاتھ ہوں تو کام چلتا رہتا ہے۔ چنیوٹ برادری کے لوگوں بہت مضبوط ٹیمیں بن چکی ہیں یہ خواتین الخدمت سے جڑی ہوئی ہیں۔ میمن برادری بھی بہت کام کر رہی ہے مگر میرا ان سے کہنا ہے کہ وہ اپنی برادری تک نہ رہیں بلکہ پورے ملک میں کام کریں۔ ''حب'' تک ہمارا کام پھیلا ہوا ہے سومیانی سمندر کے کنارے واقع ہے وہاں بھی کام ہو رہا ہے بلوچستان میں زلزلوں سے بہت تباہی آئی ہے ہم وہاں پر جا کر امدادی کام کرتے ہیں۔ ''آواران'' کے بہت سے لوگ جماعتِ اسلامی میں شامل ہو رہے ہیں۔ امدادی کاموں کے سلسلے میں جہاں خواتین نہیں پہنچ سکتیں وہاں ہم الخدمت کے مردانہ نظم کی مدد حاصل کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ ہمیں کہتے ہیں ہم سے زمین لے لو اور مسجد بنا دو۔

س: آپ پر کتنے سال الخدمت کی ذمہ داری رہی؟

ج: 1990ء میں مجھے الخدمت کی ذمہ داری ملی جو 2009ء تک میرے پاس رہی۔ 2009ء میں نظم نے مجھے حج فورم کا انچارج بنا دیا۔ اب میری دونوں بہنیں یاسمین سلیم اور نویدہ انیس الخدمت چلا رہی ہیں۔ جب میں نے الخدمت شروع کیا تھا تو اس کے فنڈ زیرو تھے میری آخری رپورٹ پندرہ کروڑ روپے کی تھی۔ ان دنوں کشمیر میں زلزلہ آیا تھا۔ میں اپنی برادری کے لوگوں کو لے کر مظفر آباد باغ میں گئی۔ زلزلے کیلئے ہمیں آٹھ نو کروڑ ملا باقی سات آٹھ کروڑ پہلے سے موجود تھے۔

س: میڈیا کے بے راہ روی کے سیلاب کو روکنے کیلئے آپ کیا کر رہی ہیں؟

ج: بے راہ رو میڈیا کے دور میں دینی سوچ رکھنے والوں کا ایک الگ چینل ہونا چاہیے جو صاف ستھرے اور معیاری پروگرام دکھائے۔ ہم لوگوں نے میڈیا کے حوالے سے بہت کام کیا ہے۔ ایک بار میں اور محترمہ عائشہ منور صاحبہ پیمرا کے دفتر گئے اور اس کے چیئرمین عبدالکریم بلوچ صاحب سے ملاقات کی اور انہیں میڈیا پر چلنے والے بُرے اشتہارات اور پروگراموں کی طرف متوجہ کیا اور انہیں کہا کہ وہ ایسے اخلاق باختہ پروگرام اور اشتہار نشر نہ کریں۔ ان سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا میری ایک ہی بیٹی ہے اس کی اصلاح کیلئے میں نے گھر میں ٹی وی نہیں رکھا ہوا۔ آپ بھی اپنے گھر سے ٹی وی نکال دیں۔ ان کی یہ بات سن کر عائشہ منور نے گود میں اٹھائی ہوئی اپنی بیٹی کو ان کی میز پر بٹھا دیا اور ان سے کہا بلوچ صاحب یہ بھی آپ کی بیٹی ہے پاکستان کی بیٹی ہے کیا آپ کی ذمہ داری نہیں کہ آپ ان بچیوں کو بے راہ رو ہونے سے بچائیں؟ ان کے اس سوال پر انہوں نے کہا ہم ملازم لوگ ہیں ہمیں اسلام آباد سے ہدایات جاری ہوتی ہیں ہم اس کے مطابق پروگرام چلاتے ہیں۔ آپ اپنی شکایات ایک درخواست میں لکھ کر مجھے دے دیں میں آپ کی درخواست اسلام آباد بھیج دوں گا۔

س: کیا اس درخواست کا کچھ فائدہ ہوا؟

ج: جب تک دینی سوچ والے لوگ اس ملک میں نہیں آئیں گے میڈیا کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

س: آپ کیسا پاکستان دیکھنا چاہتی ہیں؟

ج: میں نیا پاکستان نہیں دیکھنا چاہتی۔ جس مقصد کیلئے پاکستان بنایا گیا وہ لا الہ الا اللہ تھا۔ تحریک پاکستان نفاذ شریعت کی تحریک تھی۔ جب تک یہ مقصد پورا نہیں ہو گا تب تک جماعتِ اسلامی کام کرتی رہے گی۔ معاشرے میں اتنا بگاڑ آ چکا ہے کہ ہم دن رات دعائیں کرتے ہیں یا اللہ پاکستان کی حفاظت فرما پاکستان کو پاکستان بنا۔ مولانا مودودیؒ نے اس قطعہ زمین کو ''مسجد'' قرار دیا تھا اور مسجد میں گندگی نہیں پھیلائی جاتی۔ ہماری زندگی کا مقصد اس ملک کو اسلام کا قلعہ بنانے کا ہونا چاہیے۔

س: بتول سے آپ کا تعارف کب ہوا اور یہ کیسا پرچہ ہے؟

ج: جب میں جماعت اسلامی میں آئی تبھی میں بتول سے متعارف ہوئی۔ یہ ایک عمدہ اور صاف ستھرا پرچہ ہے اس میں تھوڑی سی جدت آنی چاہیے۔ عام لوگ اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو میں نے دیکھا کہ بتول کے مطالعہ کے بعد ان میں اچھی تبدیلی دیکھنے کو ملی اور وہ مقصدِ زندگی کو سمجھ کر آگے بڑھے۔

س: بتول کے قارئین کیلئے کوئی پیغام دیں؟

ج: اجتماعیت سے قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے۔ جو لوگ انفرادی طور پر کام کر رہے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ بڑے نظم کے ساتھ مل کر کام کریں۔ جو فائدہ جڑ کر کام کرنے سے ہوتا ہے علیحدہ رہنے سے نہیں ہوتا۔ ہمارے ساتھ اب سینکڑوں کی تعداد میں لوگ کام کر رہے ہیں۔ سب ملتے ہیں سبھی کام پلاننگ کے تحت ہوتا ہے جن جگہوں پر عورتیں نہیں پہنچ سکتیں وہاں مرد پہنچتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی میں امانت و دیانت موجود ہے۔ ہم فرشتے تو نہیں ہیں ہم میں بھی کمزوریاں موجود ہیں لیکن ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ کام دیانت داری سے کریں۔ بندہ کو صرف یہ سوچنا چاہیے کہ میں جو کام کر رہی ہوں وہ صرف اللہ کیلئے ہے پھر کوئی مشکل مشکل نہیں رہتی۔

س: آپ کو جماعت اسلامی کی طرف سے الخدمت کی بنیاد رکھنے اور بہترین کارکردگی پر ایوارڈ دیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟

ج: جب مجھے راحیل قاضی نے فون کر کے بتایا کہ آپ کو ایوارڈ دیا جا رہا ہے تو سچ پوچھیں مجھے بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔ دنیا کے ایوارڈ کی کیا حیثیت ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہمارا رب راضی ہو جائے۔ ہماری تو ٹوٹی پھوٹی کوششیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں جتنی نعمتیں دی ہیں ان کے مقابلے میں یہ کوششیں کچھ بھی نہیں ہیں۔

آپ سے ملاقات بہت خوشگوار رہی آپ کا اپنا قیمتی وقت دینے کا بہت شکریہ۔

☆.....☆.....☆

فرحت طاہر

لاؤنج

یہ بات تو ٹھیک ہے کہ لاؤنج انگریزی زبان کا لفظ ہے مگر اردو جس خطے کی زبان ہے اس کے باشندوں کی مہمان نوازی جہاں افراد کو خوش آمدید کہتی ہے وہیں در آنے والے الفاظ کو بھی نہیں لوٹاتی۔تو بس بہت سارے ساتھیوں کے ساتھ یہ لفظ بھی زبان زد عام ہو گیا ہے۔اس کے مترادف الفاظ میں بیٹھک، بر آمدہ ، گول کمرہ، اور بہت سے.....(آپ خالی جگہ پر کر سکتے ہیں اگر آپ مزید الفاظ سے واقف ہیں کیونکہ مجھے تو مضمون آگے بڑھانا ہے)

یوں تو لاؤنج ہر عمارت میں ہوتا ہے لیکن اگر گھر کے اندر والے لاؤنج کی بات ہو تو اس کے ساتھ ٹی وی ضرور لگا ہوتا ہے بلکہ درحقیقت یہ دونوں ساتھ ساتھ ہی ہماری زبان اور تہذیب میں داخل ہوئے۔یادش بخیر گھروں میں اس طرح کی ایک جگہ نانی، دادی یا بزرگ قسم کی خواتین کے لیے مختص ہوا کرتی تھی جہاں ان کا تخت براجمان ہوتا تھا۔یہ تخت گویا ان کی سلطنت ہوتی تھی! جھالر لگی چادر کے نیچے آدھی دنیا آباد ہوتی تھی۔ہر چیز ہاتھوں کی دسترس میں! پاندان میں وراثت کی مکمل داستان چھپی ہوتی۔پورا خاندانی شجرہ نوک زبان پر ہوتا تھا۔وہیں کہیں زیورات کی پوٹلی بھی دھری ہوتی تھی۔ نہ گارڈ کی ضرورت نہ لاکرز کا استعمال! چور ڈاکو کی کیا مجال کہ ہاتھ ڈال سکے ! وہیں ان کا ڈنڈا جو موجود ہوتا تھا! جوتوں اور چپل کی جوڑی بھی کسی اسلحہ سے کم نہ تھی۔ باقی چیزوں کو چھوڑیں زبان کی للکار بھی بڑوں بڑوں کا پتہ پانی کر دیتی تھی۔ ان بزرگوں میں کچھ جلالی، کچھ زیادہ جلالی، کچھ معصوم اور کچھ ستم رسیدہ بھی ہوتی تھیں مگر خاندان پر رعب سب کا برابر درجے کا ہی ہوتا تھا۔اس جگہ اور یہاں قیام پذیر ہستی کو پورے خاندان میں مرکزی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ملاقاتی کسی کا بھی ہو ان کے کسٹم سے گزرے بغیر داخل نہیں ہو سکتا تھا! اور داخلے کی شرائط بھی بعض گھروں میں خاصی کڑی ہوا کرتی تھیں۔سنا ہے کہ انگریز اور یورپی ملاقاتیوں کو بھی ساتر لباس میں ان سے ملوایا جاتا تھا۔(ظاہر ہے یہ بات پچھلی صدی کی ہے)

مزاجاً بھی ان خواتین کی کئی اقسام ہوتی تھیں مثلاً مذہبی، نیم مذہبی، روایتی، شوقین وغیرہ وغیرہ ۔ان کی نوعیت کے لحاظ سے سرگرمیاں بھی ہوتی تھیں .....وہیں کہیں اخبار رسائل کی جگہ ہوتی تھی۔قرآن اور مذہبی کتب بھی خاص اہتمام سے رکھی جاتی تھیں۔بہشتی زیور نامی کتاب ضرور ہوتی تھی، جس سے پڑھ کر یا سن کر وہ علاج سے لے کر احتیاط، ٹوٹکوں سے لے کر تر کیبات (چٹنی بنانے سے لے کر صلوٰۃ التسبیح پڑھنے تک کی) اور دعاؤں سے لے کر احادیث تک (یہ ان کے ذوق پر منحصر تھا) بتاتی رہتی تھیں۔یہیں کپڑوں کی کٹائی سے لے کر کڑھائی، بنائی کے نمونوں تک کی بریفنگ ہوتی تھی۔ظاہر ہے سلائی مشین بھی اس کا لازمی جزو تھی۔یہیں رشتے ناطے سر انجام پاتے، برات کی تعداد اور ان کی تواضع کی منصوبہ بندی ہوتی ....یہیں جھگڑے چکائے جاتے بلکہ خاندانوں کی کئی عظیم الشان جنگیں یہیں بپا ہوتیں ! خاندانی سیاست کے اسرار و رموز سکھائے جاتے۔

ہر عمر کے بچوں کی دلچسپی اس جگہ پر ہوتی۔ان کی تعلیم و تربیت میں والدین سے زیادہ اس تخت نشین ہستی کا ہاتھ ہوتا تھا۔ادب آداب سے لے کر رشتہ داریوں اور تاریخ سے وابستگی، قصے کہانیوں کے ذریعے ذہنی نشوونما! وہیں موجود کسی ٹرنک پر چڑھ کر بچے دنیا جہاں کا کھیل کھیلتے تھے۔تقریری مقابلے سے لے کر ٹیبلو تک، نظموں اور ترانے سے لے کر رول پلے (بادشاہ ہو یا کوئی ہیرو....!) تک سب یہیں ہوتا۔اسی میں کبھی ٹرنک سے گر نے پڑنے کے واقعات بھی رونما ہوتے ۔(عمران خان اور طاہر القادری کے دھرنوں میں کنٹینر پر چڑھ کر محفل کو گرمانے کا فن شاید اسی دور کی یادگار ہے جس کی پریکٹس جملہ حضرات بچپن میں شاید کر چکے ہوں گے یا پھر بچپن میں نہ کر سکے ہوں تو اب حسرت پوری کر رہے ہیں!)

تخت ایسی جگہ پر ہوتا جہاں سے وہ بزرگ ہر معاملے پر نظر رکھ سکتی تھیں۔کس کے اوقات میں تبدیلی آ رہی ہے؟ کس کا حلیہ معیار سے گر رہا

ہے؟ کون ہنڈیا غلط چلا رہا ہے؟ ظاہر ہے ان کے ملاقاتیوں میں خاندان کے ہر عمر کے مرد بھی ہوتے تھے۔ ان کی تو خاص اسکیننگ ہوتی تھی کون کس کو گھورنے کی جسارت کر رہا ہے؟ کون کس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا ہے؟ دوسری طرف گھروں میں موجود افراد خواہ وہ سگے ہوں یا سوتیلے، رشتہ دار ہوں یا خادم ! ہر دم نگاہوں کی ریڈار میں رہتے تھے۔ دن میں کم از کم پانچ دفعہ نماز کی ادائیگی کا نعرہ لگتا تھا۔ جس بچے (یا بچوں کے والدین میں سے بھی) نہ پڑھتا نظر آئے اس کی پرسش! نہ صرف پرسش بلکہ اگر طبیعت خرابی کا شک بھی گزرے تو فوراً ٹوٹکے آزمانا شروع! بچوں اور نوجوانوں پر خصوصی نظر کرم ہوتی تھی۔ ان کی زبان و بیان پر بھی خصوصی توجہ رہتی تھی.....

گردش زمانہ سے ہر چیز متروک ہوئی تو برآمدہ....لاؤنج میں تبدیل ہوا اور ٹی وی سے سجا۔ اپنی مذہبیت دکھانے کے لیے کچھ نے قرآن و احادیث بھی وہیں سجا دیں۔ مذہب کو ذاتی معاملہ سمجھنے والوں نے اس قسم کے لٹریچر کو یا تو خواب گاہوں میں یا پھر....! اور ٹرنک کی جگہ اسٹور میں یا ردی کی دکان میں ! تخت کی جگہ اسٹائلش صوفوں اور قالین نے لے لی.....(یہ تبدیلی اچانک نہیں بلکہ رفتہ رفتہ در آئی !) ٹی وی اسٹیشن کے قیام کے بعد ٹی وی ہر گھر کی ضرورت بنا..... پردے میں استثناء ملتا گیا.....اور اسّی سے زیادہ چینلز لانچ کیے گئے.....پھر تو ہر چیز نے معنی ہی بدل دیے! اس کے اثرات گھروں میں واضح نظر آنا شروع ہو گئے! خاندان میں رشتوں کی نئی تعریف رائج ہوئی۔ میاں بیوی اور بچے !...لہذا گھروں میں موجود بزرگ اندرونی کمروں میں منتقل کیے گئے اور رفتہ رفتہ دور از کار کر دیے گئے! پہلے ہر ملاقاتی کو بزرگ کلیئرنس دیتے تھے، اب ان کا دیدار کرنے شاذ و نادر ہی کوئی آتا ہے۔ بیٹھنے اور ان کی بات سننے کا تو کسی کے پاس وقت نہیں....اب دن رات بزرگوں کی صحت کا بلیٹن نشر ہوتا ہے۔ ان کے طبّی اخراجات کے باعث گھریلو بجٹ متاثر ہونے کا رونا رویا جاتا ہے۔ ان کی خدمت پر مامور فرد یا افراد چڑچڑاہٹ کا شکار نظر آتے ہیں کہ وہ اس وجہ سے معاشرتی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو کر رہ گئے ہیں لہذا ڈیجیٹل تفریحات میں مگن رہنے کا جواز بن جاتا ہے۔ ریموٹ کے لیے جھگڑے ہوتے ہیں۔ جب کھانا شیئر نہیں ہو سکتا تو تفریح کیوں! ہر ایک کو اپنی مرضی کا اسکرین دیکھنا ہے!

ہمارا اصل موضوع تو لاؤنج ہے، بزرگ تو بر سبیل تذکرہ اس میں داخل ہو گئے ہیں...اب ان کی غیر موجودگی کے باوجود گھر کی یہ جگہ آباد رہتی ہے کیونکہ ٹی وی بھی تو چوبیس گھنٹے آن رہتا ہے۔ صبح کا آغاز اگر مارننگ شوز سے ہوتا ہے تو اختتام ٹاک شوز پر بھی نہیں ہوتا کیونکہ جب والدین تھک کر آرام کرتے ہیں تو پھر بچے ڈرامہ اور فلمیں دیکھتے ہیں ! کارٹون، اشتہارات، گانے اور نغمے تو ہر وقت ہی چلتے رہتے ہیں اب کون فکر کرے کہ کیا دیکھ رہے ہیں؟ کون کیا دیکھ رہا ہے! کون کیا سکھا رہا ہے ؟ کیوں زبان بگڑ ے یا اخلاق ! کون فکر کرے؟.....یہاں سے پھر موضوع بدل رہا ہے لہذا بات کو ختم کرتے ہیں!

بات لفظ اور اس کے بدلتے کردار سے شروع ہوئی تھی۔ لازماً اسی پر اختتام بھی ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ پہلے آیا کے طور پر کام کرنے والی خواتین کو ماما کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ آج کل کی ماؤں نے بڑے فخر سے یہ ٹائیٹل اپنے لیے پسند کیا ہے! (ماما کہلوانے والی ماؤں کو اپنا یہ کردار کیسا لگ رہا ہے؟) لفظ پر یاد آیا! آج کل ایک لفظ ماسی بہت عام ہے۔ خواہ یہ کام کرنے والی تیرہ برس کی لڑکی ہی کیوں نہ ہو! اور یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ گھروں کے بچے یہ تیرہ سالہ ماسیاں ہی پال رہی ہیں !! ہو سکتا ہے آنے والے سالوں میں یہ لفظ ماں کے متبادل استعمال ہونے لگے!

عزیز خواتین ! گھگھیایئے نہیں تبدیلی کا سفر تو لاؤنج سے شروع ہو ہی چکا ہے!! زبان صرف الفاظ نہیں تہذیب بھی بدل دیتی ہے!

☆.....☆.....☆

بارے ادھوری ادبی نشست کے.....

دنیا میں بہت سے لوگ اپنے خلوص، محنت بلکہ ان تھک محنت کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کو اپنا خلوص منوانے کے لیے دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کا ہر فعل ان کے جذبہ اور خلوص کی گواہی دے رہا ہوتا ہے۔ فرحت طاہر انہی میں سے ایک ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ اجتماع عام سے قبل میں فرحت طاہر کو صرف اور صرف ''مرکزی نگران حریم ادب'' کے طور پر جانتی تھی۔ کون ہیں، کیسی ہیں سے قطعی لاعلم تھی۔ اجتماع عام کی تیاریوں کے دوران ہی شاہدہ باجی (شاہدہ اکرام، نگران حریم ادب صوبہ پنجاب، سابقہ ناظمہ صوبہ پنجاب، علم دوست قلم کار، شاعرہ وغیرہ وغیرہ) کا فون آیا.....'' قانتہ تمہیں پتہ ہے حریم ادب کا کنونشن ہو رہا ہے اجتماع عام کے دوران.....فرحت طاہر کا فون آیا تھا۔

اس کے بعد فرحت طاہر کا میسج بھی موصول ہوا کہ کیا آپ فارغ ہیں میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔

سو پیارے قارئین باتوں میں ہی ان کو بہت نفیس پایا..... مشاورت پر یقین رکھنے والی فرحت سے ملاقات حریم ادب کے گوشہ ادب میں پائی.....جس ذوق وشوق، لگن اور جذبے سے وہ کنونشن کی تفصیلات طے کرتی ہیں جو کچھ ان کی پلاننگ اور توقعات تھیں بسا اوقات تو میرے منہ میں پانی آ جاتا.....لیکن ہم (شاہدہ اکرام اور راقمہ) اکثر ان کی سادگی پر ہنستے، بھلا اجتماع عام میں ادبی کنونشن ممکن ہے!

.....تو اجتماع عام میں بھی پہنچ گئے.....گوشہ ادب بھی ڈھونڈ لیا، فرحت سے ملاقات بھی ہوگئی.....وہاں روانہ ہونے سے قبل آنے والی مشکلات کا اندازہ کر کے یا ہمارے جیسے نکموں نے ڈرا ڈرا کے کنونشن کو ادبی نشست میں بدل ڈالا.....وہاں پہنچے تو گلابی گلابی قلم، کی رنگ، بیگ اور بہت کچھ میز پر سجا رکھا تھا.....معاون صائمہ افتخار تھیں۔ توقع سے زیادہ لوگوں کی آمد نے جگہ کی تنگی تو پیدا کی لیکن اس تنگی کی وجہ سے مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑا.....جو کیمپ خالی رکھا گیا تھا ادبی سرگرمیوں کے لئے وہ بھی کھچا کھچ لوگوں سے بھرا ہوا تھا.....بہر حال سب سے بڑا مرحلہ تو خواتین کانفرنس کا انعقاد تھا.....بفضل خدا وہ ہوئی اور ''وج گج'' کے ہوئی۔ ہم لوگ درمیان میں بیٹھنے کی وجہ سے سٹیج پر کم اور سکرین سے زیادہ مستفید ہو رہے تھے۔ بچے ہیلی کیم کو انجوائے کر رہے تھے۔

اس سے پہلے ایک کتاب کی تقریب رونمائی بھی ہونا تھی جس کی اطلاع ہمیں روانہ ہونے سے پہلے ہی مل چکی تھی.....افشاں نوید جو بتول کی مستقل قلمکار رہیں، ان کی کتاب 'نوید فکر' کی تقریب رونمائی..... پروگرام دس بجے کا تھا۔ پنڈال سے گوشہ ادب پہنچے۔ فرحت طاہر نے میز پر گلاب کے پھولوں کی پتیوں کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ گلابی فرل والا میز پوش، چھوٹے چھوٹے گلابی گاؤ تکیے، افشاں نوید کی کتابوں کا ڈھیر سب کچھ موجود تھا بس مہمان خصوصی کی آمد کا انتظار تھا۔ جب بھی پوچھا جاتا اطلاع ملتی بس پانچ منٹ میں ڈاکٹر رخسانہ جبیں آنے والی ہیں.....اس عرصہ انتظار میں کئی لکھاری بہنوں سے ملاقات ہوئی۔ امینہ رشید، روبینہ فرید، نوشین جمیل جو بھی ملتا اس کا تعارف ہم سے اور ہمارا (اب ہم سے مراد صرف ناچیز ہے) تعارف ان سے ہوتا تو بے ساختہ بہنوں کے منہ سے ایک ہی فقرہ برآمد ہوتا۔

''ہم آپ کو بچپن سے پڑھتے آ رہے ہیں.....'' وغیرہ وغیرہ (خالی جگہ میں اپنی اپنی پسند کے تعریفی کلمات شامل کر لیں) کچھ عرصہ تو ہنسی خوشی فقرہ برداشت کیا، پھر طوعاً و کرھاً۔ لیکن جب ایک کافی سینئر رائٹر نے جن کو ہم از قسم خالہ جان، آنٹی وغیرہ کے زمرے میں شامل کر رہے تھے اسی فقرہ سے ہمارا استقبال کیا تو خوب فقرے چلے۔ اب یاد نہیں، کسی نے کہا کہ اصل میں صائمہ اسماء نے بھی تو لکھا ہے کہ قانتہ کو میں بچپن سے پڑھتی آ رہی ہوں گو کہ وہ قانتہ کا بھی بچپن ہی تھا.....یوں ہم نے ان حالات یا یوں کہیے کہ اس فقرے سے سمجھوتہ کر لیا!

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے انتظار کے بعد بھی جب مہمان خصوصی کی آمد نہ ہوسکی تو مجبوراً ہم نے میزبانوں سے اجازت لی مگر راستے میں قیّمہ یعنی مہمان خصوصی کے کیمپ پر نظر پڑی تو اندازہ ہوا کہ ان کا رخ اب ادبی گوشے کی طرف ہے سو ہم بھی پیچھے چل دیئے۔

کیا شاعرانہ اور آرٹسٹک انداز تھا جب ڈاکٹر رخسانہ نے گلاب کی پتیوں کے بیچ میں سے افشاں کی کتاب برآمد کی، تاثرات بیان کئے، مصنفہ کا ہلکا پھلکا انٹرویو ہوا..... یہ بہت ''ادبی لمحات'' تھے مجھے افشاں نوید، فرحت اور حریم ادب تینوں پر رشک آرہا تھا۔

نئے سرے سے اجازت لے کر پھر اپنی قیام گاہ یعنی کیمپ روانہ ہوئے۔ خواتین کانفرنس میں شرکت کی۔ مغرب کے بعد حریم ادب کی نشست کی تیاری کرنا تھی..... افسوس اس بات کا ہو رہا تھا کہ ثریا اسماء، ڈاکٹر سعدیٰ مقصود، ربیعہ ندرت (کیا آپ کا دل نہیں چاہا کہ رک جائیں) آسیہ راشد یہ سب تو گوشہ ادب کو سنسان کر کے واپس جا چکی ہیں اب کیا ہوگا.....؟ اللہ سبب الاسباب ہے۔ شاہدہ باجی کی آمد کی خبر ملی، ام عبد منیب سے ملاقات ہوئی۔ خوبصورت لب و لہجے کی شاعرہ ثریا ملک بھی پہنچ گئیں۔ لیکن جو فرشی دری بچھائی گئی اسے دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہم بے تحاشا موٹے نہیں (جیسے چیل کے گھونسلے میں ماس نہیں ہوتا حساس ادیب کے تن بدن پر گوشت کہاں سے سمائے!) وگرنہ تو اس سوا گز کی دری پر دو یا اڑھائی ادیب ہی بمشکل پورے آتے..... کہہ سن کے ہم نے فرشی دری کا حدود اربعہ پھیلایا..... فرحت سے بڑے ادب سے سوال کیا کہ پڑھنے والے تو تشریف کا ٹوکرا رکھ لیں گے، سننے والے کہاں ہوں گے؟

فرحت کا اس وقت تک اٹھک بیٹھک کر کے اور بول بول کے گلا بھی بیٹھ چکا تھا۔ خیر چند کرسیاں رکھ دی گئیں۔ دائرہ بہت تو نہیں تھوڑا سا کھلا ہو گیا۔ واہ بھئی فرحت نے مشاعرے کا سا سماں باندھا..... پھولوں کا بُکے، گاؤ تکیے، چاند نیاں..... لیکن اس وقت قلمکار بیچارے حیران پریشان نک نک دیدم دم نہ کشیدم کا منظر بنے ہوئے تھے..... تلاوت، نعت کے بعد افسانہ کی دعوت ملی تو پوچھا صدارت کون کریں گی۔ بتایا گیا کہ شاہدہ اکرام بس آیا ہی چاہتی ہیں مہمان خصوصی..... طے تو محترمہ ثریا اسماء کا کیا تھا مگر ان کی غیر حاضری میں ان کی قائم مقام عافیہ سرور کو قرار دے کر مہمان خصوصی بنایا گیا۔

افسانے کا پہلا فقرہ ادا ہوا تھا کہ صدر مجلس کی آمد باسعادت ہوئی۔ ان کو کرسی صدارت پیش کی جس کی وجہ سے حاضرین میں پھر ہلچل مچی۔ کچھ لوگوں کو ادیبوں کے پیچھے بٹھا دیا گیا۔ بھئی ادیب تو ادیب ہوتا ہے آپ اسے آگے سے دیکھیں یا پیچھے سے ایک ہی بات ہے!

فرحت نے پھر نئے سرے سے اپنی بیٹھی آواز میں تعارفی اور تعریفی کلمات پیش کئے..... افسانہ پھر سے سنانا شروع کیا۔ سپیڈ و سپیڈ افسانہ پڑھا کہ مردانہ حصے سے پروگرام شروع ہوا تو سر پر لاؤڈ اسپیکر فٹ کیا گیا تھا..... اوپر سے ستم بالائے ستم بلکہ بے ادبی پر بے ادبی، کہ گمشدگان کے اعلانات بھی شروع ہو گئے۔ میرے افسانے پر رائے بھی دی گئی تبصرے بھی ہوئے..... لیکن ساؤنڈ سسٹم سے اعلانات اور بیرونی مہمانوں کے اعزاز میں منعقد کئے پروگرام کی آوازوں نے اب یہ صورتحال پیدا کر دی تھی کہ بقیہ ادبی نشست کے لئے ''اشاروں کی زبان'' کا ماہر ہونا لازمی تھا..... ہم نے چشم تصور سے اپنے افسانے کے بعد کے پروگرام کو 'اشاروں کی زبان' میں ہوتے دیکھ کر توبہ استغفار بھی کر لیا..... ہاں میرے افسانے سے قبل روبینہ ناز اور ثریا ملک شاعری کی گھن گرج میں آئیں۔ روبینہ کی نظم کا بنیادی خیال اور ثریا کا نظم پیش کرنے کا انداز بہت بھایا..... اشعار یاد اس لئے نہیں رہے کہ لکھے ہی نہ تھے۔ لیکن شاعری کا اچھا نمونہ تھا۔

گو کہ نشست کا ہنگامی طور پر گلا گھوٹنا پڑا، لیکن اس ادھوری ادبی نشست نے یہ بتایا کہ انسان کرنا چاہے تو کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے۔ فرحت نے اتنے شور شرابے، ناموافق حالات کے باوجود جو کوشش کی، لکھنے والوں کو جمع کیا یہی بہت ہے..... باقی سب کچھ تو چلتا ہی رہتا ہے۔ میری درخواست ہے کہ اگلے اجتماع عام میں اسپیکرز صرف اسی طرف ہوں جہاں سے خواتین کا گرین سگنل ملے اور کچھ نہ کچھ سیٹنگ ایسی ضرور ہو کہ شاعر ادیب، طالبات سب اپنی کارکردگی امن اور سکون کے ساتھ پیش کر سکیں۔

بہت سے لوگوں نے ''قانتہ رابعہ'' کو ڈھونڈا..... تحریروں پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ جزاک اللہ لیکن قانتہ رابعہ بس ایک ہی ہستی کو ڈھونڈتی رہی اور وہ تھی صائمہ اسماء۔ ان اللہ مع الصابرین یار زندہ صحبت باقی!

☆.....☆.....☆

مینارِ پاکستان کے سائے تلے

مثبت تبدیلی کی نوید

رشیدہ صدف

لانا ہے دستورِ اسلامی کرنے یہ اعلان چلو
مینارِ پاکستان چلو

۲۱،۲۲،۲۳ نومبر کو ہونے والے اجتماعِ عام میں شرکت کی مسلسل توفیق ملی، الحمدللہ!

ہر اجتماع چاہے وہ مینار پاکستان میں ہوا، اضاخیل میں، قرطبہ میں، اسلام آباد فیصل مسجد میں یا شاملے بھٹیاں میں.....ایک تاثر مشترک ہوا کہ یہ حج کی طرح کا اکٹھ ہے، خیمہ بستی منیٰ کا نقشہ یاد آیا، فرق صرف اتنا کہ وہ پوری دنیا سے آنے والے لوگ ہوتے ہیں اور ادھر پورے پاکستان سے، پورے ملک کے کونے کونے سے لاکھوں مرد و خواتین، خاندان کے خاندان، بچے بڑے جوان آنکھوں میں اسلامی پاکستان، خوشحال پاکستان کا خواب سجائے دیوانہ وار چلے آئے تھے۔ یہ کسی ایک برادری یا نسل، کسی ایک قومیت یا علاقے کے لوگ نہیں، مختلف زبانیں بولتے مگر ایک دوسرے میں گھلے ملے اور ہم آہنگ، ایک خواہش اور ایک مقصد میں جڑے ہوئے کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا کلمہ سربلند ہو جائے جو اس پاکستان کو وجود میں لانے کا مقصد تھا۔

۲۱ نومبر جمعۃ المبارک شام کے قریب جب لاہور منزل تک پہنچے تو یوں لگا ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ ہم سے پہلے پہنچ چکے ہیں، جو وسیع و عریض کیمپ مخصوص تھے بھر چکے تھے اور ہر طرف سے آوازیں آ رہی تھیں کہ اندر کوئی جگہ نہیں، سارے انتظام کم پڑ گئے ہیں۔ غیر متوقع حاضری اور اس کثرت سے سب ہی اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے، نالاں نہیں تھے۔ سردی بڑھ رہی تھی، ابھی مسلسل قافلے آ رہے تھے، جس کو جہاں جگہ ملتی وہیں اپنے بستر رکھ کر بیٹھ جاتا، مرد کارکنان بھی پوری طرح چوکس سب کی مدد کر رہے تھے۔

ہم نے بھی بس سے بستر اتارے اور ایک طرف ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ ہر کسی کو نماز کی فکر ہونے لگی، مرد حضرات فکر مند تھے کہ خواتین اور بچوں کو اندر اتنے سامان کے ساتھ کس طرح پہنچائیں۔ ہم عورتیں حوصلہ دے رہی تھیں، ہر کوئی دوسرے کو اپنے پر ترجیح دے رہا تھا، آرام کا خیال رکھ رہا تھا۔ اتنے میں ہمارے پاس ڈاکٹر احسان اللہ شاہ صاحب آئے۔ انھوں نے ڈھیر ساری چھلیاں خرید کر دیں سب کو، ظاہر ہے بھوک بھی لگی ہوئی تھی بانٹ کر دے دیں اور دل جذبۂ تشکر سے جھک گیا۔

جب سامان کے ساتھ اندر پہنچے تو پتہ چلا اب گجرات کے کیمپ میں جگہ نہیں ہے ناظمہ اجتماع حمیرا طارق صاحبہ نے جب مجھے دیکھا تو بڑھ کر سلام کیا اور بڑے ادب سے کہا، باجی آپ یوتھ کے کیمپ میں آ جائیں جو بالکل سٹالز کے ساتھ تھا۔ چہرے سے حمیرا بہت ہی تھکی ہوئی لگ رہی تھی مگر مسلسل جگہ بنا کر دے رہی تھی۔ میں نے سب کے بستر بچھوائے جگہ بنوائی ماشاءاللہ ایک گھنٹے کے اندر سارا کیمپ اتنا بھر گیا کہ درمیان میں چلنے کی جگہ مشکل ہوگئی ہر کوئی شکر ادا کر رہا تھا کہ ہم کیمپ کے اندر ہیں، سٹیج سے مسلسل آوازیں آ رہی تھیں اسلامی پاکستان ہی خوشحال پاکستان ہے، نمازیں ادا کر کے بس سو گئے۔

دوسرا دن یعنی ۲۲ نومبر بھرپور دن تھا جس میں خواتین کانفرنس بھی تھی ہزاروں خواتین نے یہ کانفرنس بڑے ہی سکون سے خاموشی سے دیکھی سنی، جس کے سارے پروگرام ہی بڑے خوبصورت اور جاندار تھے ایک ایک بات سونے کی تاروں سے لکھنے کے قابل، تفصیلی روداد پورے تین دن کی لکھوں تو مضمون بہت طویل ہو جاتا ہے کہ کس طرح سارے ماحول کا جائزہ لیا اور آنکھوں کو ٹھنڈا کیا، مرکزی، صوبائی قیادت کو ملے سب پر بہت پیار آیا کہ اصلی محنت تو ان لوگوں کی ہے ہم تو بس پھل کھاتے ہیں۔

راہ چلتے کتنے پرانے ساتھیوں سے ملاقات ہوگئی، ساتھ ساتھ تقاریر بھی سنیں پھر سب سے خوبصورت ملاقات لیڈیز پولیس سے ہوئی، ان سے میری ساتھی بہن فرخ وسیم نے پوچھا آپ نے بڑے بڑے جلسے دیکھے ہیں، دھرنوں میں آپ کی ڈیوٹیز ہوتی ہیں آپ نے ہمارے

اس اجتماع کو کیسا پایا، کہنے لگی بہت منظّم، پرامن اور سب سے بڑھ کر ادھر ہم نے ایک چیز جو خاص دیکھی وہ ہے حیا۔ کوئی کسی کو تنگ نہیں کرتا، تنگ کرنا تو بڑی دور کی بات ہے مرد نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ سب عورتوں کو ماں بہن کی طرح عزت دیتے نظر آتے ہیں اور مزید بہت سی باتیں ہوئیں ہم نے بھی موقع غنیمت جان کر انھیں بھرپور دعوت دی اور چائے پلائی۔ اس طرح سٹالز بھی گھوم پھر کر دیکھے ذرا بھی ہڑبونگ نہ تھی، شور ہنگامہ نہ تھا، کھانا بھی آتا رہا خرید کر بھی لاتے رہے ہر کوئی دوسرے کو کھلانا چاہ رہا تھا ایک پرامن سی بستی پرسکون شہر بسا تھا۔ اگر کہیں گند بکھرا تھا یا بدنظمی تھی عامۃ الناس کے تربیت نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔

ہم نے ہر طرف گھوم پھر کر جائزہ لیا کبھی سنہری دھوپ کی تمازت میں، کبھی سرمئی شاموں کی خنکی میں کبھی آدھی رات کو سخت اندھیرے میں، لوگ چلتے پھرتے بھی اور پنڈال میں بھی لگی سکرینوں کے سامنے مقررین کی تقریریں غور سے سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو نہیں بھی سن رہے تھے وہ چلتی پھرتی دعوت تھے۔ نورانی چہروں والی بزرگ خواتین بھی تھیں چمکتی آنکھوں والی نوجوان طالبات بھی۔ مردوں کا حصہ الگ تھا جو میلوں پر محیط تھا، پانچ لاکھ سے زائد حاضری بتائی جا رہی تھی۔ میڈیا کے پیٹ میں تو مروڑ اٹھ گئے۔ کچھ نے تو نہ چاہتے ہوئے بھی تعریفی جملے کہہ دیئے، کالمز لکھے تبصرہ کیا مگر کچھ خبثِ باطن کو چھپا نہ سکے۔

جماعت اسلامی کے نئے امیر سراج الحق صاحب کی شخصیت کی تو دوست کیا مخالفین بھی تعریف کر رہے ہیں۔ ان کے تازہ ترین منشور نے عوام کو بہت حوصلہ دیا ہے۔ انھوں نے واضح کہا ہے کہ اگر ادھر اجتماع میں آنے والا ہر فرد صرف دس لوگوں کو ہم نوا بنا لے تو کوئی وجہ نہیں کہ الیکشن میں ہماری اکثریت نہ ہو۔ سراج الحق کے عوامی ایجنڈے پر اس لیے بھی اعتبار کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے حکومت میں رہ کر بھی اپنی درویشی نہیں چھوڑی۔ مجلس عمل کی صوبائی حکومت میں تھے مگر عام لوگوں کی طرح رہتے تھے۔ آج بھی کرائے کے گھر میں ہیں۔ ہر کوئی انھیں مل سکتا ہے۔

مجھے امید ہے یہ اجتماع عام، اسلامی انقلاب اور مثبت تبدیلی کی نوید ثابت ہوگا ان شاءاللہ، جماعت اسلامی اس ملک کی واحد سیاسی و دینی جماعت ہے جس میں موروثیت نام کی کوئی چیز نہیں۔ مولانا مودودیؒ سے لے کر سراج الحق تک، ادھر حمیدہ بیگم سے لے کر دردانہ صدیقی تک تمام امیر منتخب ہو کر آئے اور سب سے بڑی بات کہ کوئی بھی ذاتی خواہش نہیں رکھتا ہر سطح کا امیر اسی طرح ذمہ داریوں کے خوف سے اس وقت لرز رہا ہوتا ہے، رو رہا ہوتا ہے جب وہ حلف لیتا ہے۔ اس بات کے دشمن بھی معترف ہیں، آج تو اپنے ملک پاکستان ہی میں نہیں دنیا بھر میں بھی ایک بہت بڑا طبقہ مولانا مودودیؒ کے افکار سے متفق نظر آتا ہے، حالیہ اجتماع عام میں پچاس سے زائد ملکوں سے مندوبین تشریف لائے تھے، پھر فلسطین کی نمائندہ خاتون نے خواتین کانفرنس بعنوان ''بدلتی دنیا میں عورت کا کردار''، میں پرجوش انداز میں اپنے خیالات کا اظہار عربی میں کیا مگر الفاظ کا چناؤ لہجے کا زیر و بم ہر بات کو سمجھائے جا رہا تھا۔ برطانیہ سے رابعہ صادق صاحبہ نمائندہ کر رہی تھیں۔ بہت ہی حسین گلدستہ تھا جس کے ہر پھول کی مہک الگ تھی، ڈاکٹر رخسانہ صاحبہ کا اتنا پرجوش انداز پہلی بار سننے اور دیکھنے کو ملا، حلف برداری کے منظر نے تو رلا ہی دیا، پھر امیر جماعت سراج الحق صاحب کا خطاب بہت جاندار اور شاندار تھا تین وعدے انھوں نے سب سے لیے کہ جھوٹ نہیں بولیں گے، غیبت نہیں کریں گے، حرام نہ کھائیں گے نہ کھلائیں گے اور ایک تقریر میں نماز کی پابندی کا بھی وعدہ لیا۔

الغرض یہ اجتماع عام بغیر کسی حادثے کے بخیر و عافیت مکمل ہوا، لوگ ایک اچھی امید لیے آنکھوں میں خوبصورت خواب سجائے گھروں کو واپس آئے۔ یوں لگا جیسے یہ بھی جہاد ہی تھا۔ مجھے تو بس ایک ہی بات نے مجبور کیا کہ صحت کی خرابی کے باوجود ضرور اس مقدس سفر پہ نکلوں کہ کبھی اسلامی انقلاب کی نوید ملی کبھی اللہ کی زمین پر نظامِ مصطفیٰ قائم ہوا تو یہ سفر یہ درخت یہ پتھر یہ جگہ گواہی دے گی کہ اس میں کچھ ہمارا حصہ بھی ہے!

☆.....☆.....☆

چند تاثرات

عالیہ شمیم

دنیا بھر کی تمام کفر کی طاقتوں کو امت مسلمہ کے اتحاد سے خوف ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمان اگر اکھٹے ہو جائیں تو وہ پھر ان کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتے۔ جماعت اسلامی صرف پاکستان کے اندر ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں مسلمانوں کے اتحاد کی داعی ہے اور پاکستان و دوسرے مسلمان ممالک کے مسائل کا حل عالم اسلام کے اتحاد ہی میں مضمر سمجھتی ہے۔ جماعت کی امتیازی خصوصیت ہے کہ اس نے ذاتی خاندانی اور گروہی سیاست کے بجائے نظریاتی سیاست کی اعلیٰ مثال پیش

کی ہے۔موجودہ رائج سیاست میں حصول اقتدار اور اس کے مادی فوائد ہیں جبکہ جماعت کے نزدیک ایسے اقتدار کی کوئی قدر و قیمت نہیں بلکہ وہ اقتدار کو اس بنیادی تبدیلی کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے جو ملک ومعاشرے میں قرآن وسنت کے مطابق ہو۔

عدل وانصاف کی علمبردار جماعت اسلامی نے مینار پاکستان کے سائے تلے ملک گیر اجتماع عام میں تحریک تکمیل پاکستان اور اسلامی پاکستان ہی خوشحال پاکستان ہے کا آغاز کیا۔اس موقع پر بیرونی ممالک کے علاوہ پاکستان کے تمام صوبوں کے بڑے شہروں، گاؤں گوٹھوں، دیہاتوں اور پس ماندہ علاقوں سے کثیر تعداد میں مرد وزن کی شرکت نے ثابت کر دیا کہ قوم بیدار ہے، ملک میں جاری کرپشن، بدامنی، لاقانونیت، مہنگائی، عریانی وفحاشی سے متنفر ہے اور ملک میں اسلامی قوانین کا نفاذ چاہتی ہے۔اس سلسلے میں دوران اجتماع بیرون ملک کے علاوہ پاکستان کے مختلف صوبوں اور طرزِ معاشرت رکھنے والی بہنوں سے چند سوالات پر مشتمل تاثرات لیے گئے مثلاً

☆ محدود وسائل سے قائم کی گئی اس بستی کو بسانا کیسا لگا؟

☆ کیا آپ جماعت کے پیغام اور سلوگن سے واقف ہیں؟

☆ پروگرام کیسے لگے؟

دورانِ اجتماع پر کروائے گئے اس سروے فارم پر خصوصاً نوجوان بچیوں نے تحریری جوابات دیے اکثریت نے زبانی جوابات دیے۔چند منتخب تأثرات یوں ہیں۔

☆ U K کی عائشہ صدیقہ نے کہا کہ اتنے عرصے سے ملک سے باہر ہوں مگر آج یہاں آ کر بہت اپنائیت کا احساس ہوا۔ملکی حالات کے بارے میں آگاہی ہوئی۔ایمان میں اضافہ ہوا، یہاں آ کر تین دن ساتھ رہ کر میں نے قربانی کا عملی مظاہرہ دیکھا ہے، اکابرین کو رات گئے سخت سردی میں شرکاء اجتماع کے آرام کے لیے کوشاں دیکھا ہے، خود بھوکا رہ کر اپنے ساتھیوں کے لیے ایثار دیکھا ہے اور میں سمجھتی ہوں وہ دن دور نہیں جب محبت، ایثار، اخوت و بھائی چارہ پر مشتمل انقلابی وخوشحال معاشرہ کی کرنوں سے وطن عزیز مہکے گا۔

☆SPAIN کی شمسہ کنول نے اپنے تاثرات دیتے ہوئے کہا کہ دل میں بچوں کی تربیت کی خواہش تھی ان کو رب سے جوڑنے اور سخت سے سخت حالات میں مقابلہ کرنے کی اسپرٹ پیدا کرنا چاہتی تھی اتنا سخت جان کہ بھوک پیاس کی آزمائش بھی ان کا ایمان نہ ڈگمگا دے اور الحمدللہ یہاں آ کر اتنا موثر اور سیر حاصل اجتماع ملا ہے کہ میں اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔باتھ روم کی پریشانی، بھوک، سردی کا احساس جب ہوتا ہے جب آپ تنہا مشقت جھیلیں، لیکن جماعت کی صورت میں یہ تکالیف تکالیف نہیں رہتیں، ایک دوسرے کے ساتھ باہم پشت پناہی، ہم آہنگی، نہ صرف قوت میں اضافہ کرتی ہے بلکہ مشترک مقصد کے حصول کے لیے اس کے تقاضوں کے مطابق ڈھال بھی لیتی ہے۔جماعت کی قوت فرد کی قوت سے کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔اور لاکھوں لوگوں کی حاضری اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ جماعت کے سلوگن اسلام پاکستان اور خوشحال پاکستان کی طلبگار ہے۔

☆ بہاولپور کی سعدیہ ذیشان نے جوشیلے لہجے میں کہا کہ میں 1998 فیصل مسجد میں ہونے والے اجتماع عام کے بعد اب شریک ہوئی ہوں اس دوران سعودی عرب میں رہائش پذیر تھی اس لیے شرکت کا موقع نہ مل سکا تھا۔یہاں آنے سے قبل نہ صرف میں ایکسائیٹڈ تھی بلکہ میرے بچے بھی پرجوش تھے۔خوش آمدیدی استقبالیہ بہت عمدہ تھا۔جماعت کی رہنما خواتین سے طویل عرصے بعد کی ملاقات بہت اچھی رہی اور میں تو کہتی ہوں کہ اتنے عرصے بعد تمام خواتین سے اکٹھے ملنا اجتماع ہی کی بدولت ہوا۔اجتماع عام وقت کی اہم ضرورت ہے جو فرد کو فرد سے جوڑنے اور افراد کے مجتمع ہونے کی علامت ہے۔میرے بچے جمیعت کے پرجوش اور ایمان افروز ترانوں کے عادی ہیں جماعت کو اپنا تشخص برقرار رکھنا چاہیے اور معاشرے میں رائج مغربی کلچر کے خلاف عملی قدم اٹھانا چاہیے۔اس اجتماع کا پاکیزہ ماحول اس بات کا بین ثبوت ہے کہ انشاءاللہ جماعت برسر اقتدار آ کر معاشرے سے بے حیائی وعریانی کا خاتمہ کر دے گی اور اپنے سلوگن ان الحکم الا للہ کو عملی طور پر نافذ کرنے کیلئے کوشاں رہے گی۔

☆ خیبر ایجنسی کی نذرانہ عبدالرؤف نے کہا کہ میں نے دوسری بار جماعت اسلامی کے منعقدہ اجتماع عام میں شرکت کی ہے اور آج کثیر تعداد میں حاضر افراد کو ہر قسم کی سہولیت دینے میں انتظامیہ کے ہر فرد کو سرگرداں دیکھ کر جماعت کے خلاف لوگوں کی پھیلائی افواہیں غلط نظر آئی ہیں، ہمارے دل خوش ہیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سب رنجشیں دور ہوگئیں۔جب لوگوں کی کھانا کم پڑ جانے صبر واستقامت اور بھوک پیاس

برداشت کرنے کا جذبہ دیکھا تو یہی خیال آیا کہ جماعت تو دراصل غریب جماعت ہے اور اس کے قائدین نام کے امیر ہیں مگر ہیں غریب اور غریبوں کا نہ صرف درد محسوس کرتے ہیں بلکہ خود بھوکے رہ کر دوسروں کی بھوک کو دور کرنے میں اس ماں کی مانند سرگرداں رہتے ہیں کہ چلو کسی کا پاپے سے، کسی کا چاول سے، کسی کا چنوں سے اور کسی کا رات کی بچی روٹی ہی سے پیٹ تو بھر دیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بھوکا سو جائے۔ اتنی بڑی اجتماعیت اور توقع کے خلاف حاضری پر کھانے میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ اور یہ بھی اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ واقعی اجتماعیت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے اللہ کی تائید و نصرت کے بغیر جماعت اسلامی کا ملک گیر اجتماع نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اپنے اندر تین دنوں کے اس تربیتی پروگرامات میں شرکت کے بعد نیا ولولہ و حوصلہ لے کر جاؤں گی کہ کم وسائل اور حالات کی سختی کے باوجود اسلامی پاکستان اور خوشحال پاکستان کی صبح ضرور طلوع ہو گی انشاءاللہ۔

☆ چترال کی ناہیدہ، لاہور کی صائمہ، گوجرانوالہ کی بینش اسلم، پشاور کی ماریہ خلیل، حیدرآباد کی نازیہ سلیم، مانسہرہ کی صابرہ سعداللہ کوئٹہ کی زینب و آصفہ امیر محمد، مردان کی نعیمہ عبدالعلی، شاہدرہ کی عذرا حنیف کے مجموعی تاثرات تھے کہ پہلی بار شرکت کی ہے۔ محبت، ایثار، قربانی و پیار کا عملی مظاہرہ نظر آیا۔ اتنی بڑی تعداد، صرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے یکبارگی تو خوف بھی محسوس ہوا یہ سوچ کر کہ اگر بھگدڑ مچ گئی تو بے شمار جانیں تلف ہو جائیں گی مگر آفرین ہے جماعتی نظم وضبط پر کہ کوئی جان لیوا حادثہ الحمدللہ پیش نہیں آیا۔ اتنی بڑی تعداد پر مشتمل تین روزہ بستی قائم کرنا، غذائی ضروریات، ایمرجنسی پر فوری علاج کی سہولت، کلینک و اسپتال کی 24 گھنٹہ OPD اور کل وقتی لیڈی ڈاکٹر کی موجودگی، بچوں کیلیے قائم گوشہ اطفال میں ٹرینڈ ٹیچرز کی نگرانی میں ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام، بھرپور انتظامیہ جو کسی بھی مشکل میں ہمہ تن مدد کے لیے تیار، یہ سب بلاشبہ جماعت اسلامی ہی کا خاصہ ہے جو نہ صرف دینی امور اور اسلام کی دعوت کی امین ہے بلکہ بغیر تفریق کے اس کے قائدین و کارکن کڑے سے کڑے حالات میں بھی اپنے آرام کی پروا کیے بغیر انسانیت کی خدمت کے لیے کوشاں ہیں۔ اور انشاءاللہ وہ وقت دور نہیں جب عدل و انصاف، صحت، اور انسانی احترام سے بھرپور پاکستان بنے گا۔ تمام پروگرام بہت زبردست تھے اور ایک نیا عزم لے کر یہاں سے جائیں گے کہ اپنی کردار سازی کر کے اسلام کی روشنی دوسروں تک ضرور پھیلانا ہے اور غلبہ اسلام کے لیے جماعت اسلامی کا ساتھ دینا ہے۔

☆ کراچی کی طیبہ بلال نے کہا کہ میرے لیے شرکت کا پہلا موقع نہیں، میں اپنے ہوش میں ہر بار جماعت اسلامی کے ہونے والے اجتماع عام میں آئی ہوں، تب بھی جب میرا بچپن تھا، پھر شادی کے بعد اور اب اپنے بچوں کیساتھ شریک ہوں۔ ہمیشہ کی طرح جماعت اپنے مثالی انتظامات اور نظم وضبط کیساتھ یادگار اجتماعات منعقد کرتی رہی ہے اور اس بار بھی یہی روایت برقرار رہی ہے گو کہ ریکارڈ توڑ حاضری کی وجہ سے بہت سوں کو خصوصا پہلی بار شرکت کرنے والوں کو ناقص انتظام لگے ہونگے لیکن جب تعداد چار گنا ہو جائے تب تو یہ بے قاعدگی ہو جانا لازمی امر ہے لیکن ان سب کے باوجود جس طرح خود قائدین جماعت سخت سردی میں اپنا آرام، بھوک پیاس سے بے نیاز ہو کر شرکائے اجتماع کو ریلیف دینے میں لگے رہے اس کی مثال نہیں۔

انسان کو ضعیف و خطا کار بنایا گیا ہے ہر پہلو سے اصلاح کی ضرورت ہر ایک کو ہے بجائے تنقید کرنے کے اپنی اصلاح کی جانی چاہیے اپنا احتساب، اپنی اصلاح، اور استغفار ہی تعلق باللہ پیدا کرتا ہے۔ جماعت کا مضبوط مؤقف اور اسلامی پاکستان و خوشحال پاکستان کا سلوگن اس بات کا متقاضی ہے کہ تین روزہ تربیتی اجتماع میں شرکت کے بعد اپنے اندر یہ عزم توانا رکھیں کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے فریضہ اقامت دین کا کام ہمہ وقت کریں گے اور اللہ سے اپنی کوتاہیوں، خطاؤں، زیادتیوں کی معافی طلب کریں۔ اللہ غفور الرحیم ہی سے یہ توقع کریں کہ وہ اپنی راہ میں کی جانے والی ان ناقص کوششوں کو قبول فرمالے اور اپنی مغفرت سے ڈھانپ لے۔

☆.....☆.....☆

میری لائبریری سے

کتاب کا نام: نویدِ فکر

مصنفہ: افشاں نوید

پبلشر: حریمِ ادب، اکیڈمی بک سنٹر (A.B.C)

D-35 بلاک 5، فیڈرل بی ایریا کراچی، 75950: فون نمبر: 02136809201

جی پیارے قارئین السلام علیکم، بچپن سے اشتہار سنا کرتے تھے نام بھی اچھا کام بھی اچھا، ''صوفی سوپ ہے سب سے اچھا۔'' (صوفی والوں نے اجتماع عام میں جس خدا خوفی کے ساتھ پانی مہیا کیا تو اتنی مشہوری تو بنتی ہی ہے) بہر حال آج جس کتاب کا تذکرہ مقصود ہے اس میں مصنفہ اور پبلشر دونوں ہی بہت اچھے ہیں۔ افشاں نوید اور حریم ادب ہر دو کے نام حلقہ خواتین جماعت اسلامی سے آشنا لوگوں کے لیے معروف ہیں۔ افشاں نوید کو ہم ایک قلمکار کی حیثیت سے اور حریم ادب کو ادبی تحریریں سننے سنانے کے پلیٹ فارم کے طور پر جانتے تھے۔ یہ تو اللہ کے فضل سے فرحت طاہر، خریم ادب کو یا حریم ادب، فرحت طاہر کو ملی ہیں، نت نئے حیرت انگیز کارنامے وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ متذکرہ کتاب بھی حریم ادب کے پلیٹ فارم سے چھپنے والی کتاب ہے۔ اس سے قبل حریم ادب کے تحت مجلّے شائع ہو چکے ہیں۔ آیئے قارئین کتاب کے صفحات کھولتے ہیں۔

افشاں نوید کے کالم، کالمانہ ضروریات کو پورا کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں۔ مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں اور کسی حد تک حل بھی پیش کرتے ہیں۔

افشاں کا قلم ''افسانوی رنگ ڈھنگ'' میں خوب رواں ہوتا ہے۔ ہر کالم اپنے اندر پورا افسانہ بلکہ بسا اوقات ناولٹ کا سامان رکھے ہوئے ہے۔ ہر کالم دعوت فکر دیتا ہے۔ ہر کالم مقصدیت کی طرف بلاتا ہے اثر انگیز ہے اور معاشرتی موضوع پر مشتمل ہے۔ زیادہ تر کالم ''بتول'' کی زینت بن چکے ہیں مگر نہ جانے پیش لفظ میں اس بات کا تذکرہ کیوں نہیں ہے۔

افشاں نوید کے کالموں کی پہچان یہ ہے کہ آغاز واقعہ سے کرتی ہیں اس کے بعد سوال اٹھاتی ہیں اور حل پیش کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''پکے ٹائم سجناں دے..... جنازہ دیکھ کر، اپنی اوقات یاد رکھنا وغیرہ۔''

''تصویر کا دوسرا رخ..... سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے اس ریمارک پر ہے جو انہوں نے حکمرانوں کو تنبیہہ کرتے ہوئے دیا کہ عمر فاروق کی سیرت سے سبق حاصل کریں۔ قارئین جن حکمرانوں کو سیرت عمر فاروق سے سبق حاصل کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے وہ سارے ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔ افشاں نوید نے ان حکمرانوں کو ان کے شاہی اخراجات کا آئینہ دکھایا ہے۔

وزیراعظم کے دفتر اور گھر کا خرچ 53 کروڑ 87 لاکھ روپے ہے..... (جولائی 2009) اب تو سو فیصد بڑھ گیا ہے۔

اسلام آباد کے ایوان صدر کے اخراجات 35 کروڑ سالانہ ہیں (جولائی 2009ء) صرف ایک جہاز کی تزئین و آرائش پر 58 کروڑ صرف ہوتے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ عمر فاروق کا دور حکومت ہے جس کی ایمان افروز مثالیں کالم میں موجود ہیں۔ اس تقابلی جائزے کے بعد سوال کیا گیا ہے کیا مالاکنڈ کے 40 لاکھ لوگ جو بے گھر ہوئے (اب آئی ڈی پیز کہہ لیں) کی مفلسی میں فرق پڑا؟ ایوان صدر کا خرچہ کم ہوا؟

دونوں رخ سامنے رکھ کے حل یہی دیا گیا ہے آپ بھی پڑھیے اور سر دھنیے اگر پاکستان کے 17 کروڑ زندہ عوام بیداری کی لہر کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں تو نہ صرف ان ناعاقبت اندیش حکمرانوں سے نجات ممکن

ہے بلکہ ہم اپنے خارجی اور داخلی دشمنوں سے نجات حاصل کر کے دنیا کو امن کا گہوارہ بنا سکتے ہیں.....

قارئین! کچھ کالم بہت حساس موضوعات پر ہیں وہ موضوعات جن پر قلم اٹھانے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے، اٹھالیں تو لکھنے والے کی اخلاص نیت پر حملے کا امکان بھی ہے۔ مثلاً ''چمن کی فکر کر ناداں.....'' ایک بزرگ رکن جماعت کی وفات پر تحریر کیا گیا ہے جو 6 بیٹے بیٹیاں اور بڑی تعداد میں پوتے پوتیاں چھوڑ کر گئے لیکن اقامت دین کی جدوجہد میں آخری لمحے تک اس معروف رکن کی آل اولاد میں کوئی تحریک سے وابستہ نہیں.....! افشاں کے بقول یہ حادثاتی واقعہ نہیں کہ پوری زندگی اقامت دین میں گزارنے کے باوجود اہل وعیال میں کوئی بھی اس راہ پر گامزن نہ ہو۔ اس چراغ تلے اندھیرے کی وجوہات کے لئے کالم سے رجوع کریں۔

مصنفہ کے کالموں کی ایک خوبی عام فہم ہونا اور انداز بیان کی بے ساختگی بھی ہے۔ ذرا ملاحظہ کریں۔ آپ کو بھی تصویریں دیکھنے کا شوق ہے ناں اور تصویریں دیکھنا بھلا کسے اچھا نہیں لگتا! البم میں سلیقے سے سجی ہوئی تصویریں ہوں یا اطراف میں چلنے پھرنے والے لوگ لیکن ان تصویروں کو دیکھنے سے پہلے یہ جان رکھیے کہ ہم اپنی آنکھوں سے ہر تصویر نہیں دیکھ سکتے اس لئے کہ بقول شخصے' آنکھ کافی نہیں نظر چاہیے۔

اور نظر کو تصویر کون سی دکھانا ہے؟

ارے میں آپ کو تصویر دکھاتے ہوئے بتانا بھول گئی کہ یہ ہے کس کی تصویر..... پنجاب کے وزیراعلیٰ کے سیکریٹریٹ کی! (جنوری 2010ء) وزیر اور وہ بھی اعلیٰ ..... یہی آن بان ہونا چاہیے! یہاں 98 سکیورٹی کیمرے نصب ہیں.....460 سکیورٹی اہلکار تعینات ہیں پھول پودوں کے حسن کی دیکھ بھال کیلئے ایک کروڑ 44 لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں! اور اس کے گاڑیوں کے پول میں 9 گاڑیاں بلٹ پروف ہیں۔ وی آئی پی گاڑیاں 51 کروڑ 18 لاکھ روپے میں خریدی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ 137، سرکاری گاڑیاں ہمہ وقت سیکریٹریٹ کے استعمال میں رہتی ہیں۔ اس عالیشان عمارت کا 85 ہزار مربع فٹ ایریا تعمیر شدہ ہے اس حساب سے کوڈ ایریا پر 4150 روپے فی مربع فٹ خرچ کئے گئے ہیں۔ اس سیکرٹریٹ کا سالانہ بجٹ 34 کروڑ 90 لاکھ روپے سالانہ ہے.....!

کیا ان گاڑیوں میں بیٹھنے والے وزیراعلیٰ کو دوسری تصویر نظر آسکتی ہے۔

کتاب میں عافیہ صدیقی، اس کے بچوں کے احساسات پر لکھے کالم کتاب کی جان ہیں اور خون دل سے لکھے گئے ہیں۔

قارئین کتاب میں کچھ موضوعات ایسے ہیں جن کو خشک قرار دیا جاتا ہے لیکن مصنفہ نے محنت سے ان پر بھرپور مواد مہیا کیا ہے مثلاً ''ماذا ینفقون'' میں احادیث اور ان کی روشنی میں اپنے قلب کا جائزہ ہم صرف نماز روزہ کے ذریعہ یعنی عبادت کے ذریعہ جنت میں داخل ہونے کے خواہشمند ہیں جبکہ جنت تک عبادات کی ٹھنڈی سڑک نہیں جاتی.....! وہی سوال جو بشیر بن الخصامیہ سے تھا (تفصیل کتاب میں موجود ہے) وہی مجھ سے اور آپ سے ہے ''جہاد نہیں' صدقہ نہیں تو جنت میں کیسے داخل ہو گے؟ صدقہ اور جہاد کے لیے ہمیشہ دل کھلا رکھنا چاہیے۔ ایک آدمی اللہ کے سامنے کھڑا ہوگا۔ دائیں طرف دیکھے گا تو آگ ہوگی بائیں طرف دیکھے گا تو آگ ہوگی بس اپنا بچاؤ کر لے ہر آدمی آگ سے، اگرچہ کھجور کے ایک دانے کو صدقہ کر کے اگر وہ بھی نہ ہو تو پاکیزہ بات کے ذریعہ۔ (اصل چیز کی مقدار نہیں آگ سے بچاؤ ہونا چاہیے)

کتاب پڑھ کر مصنفہ بیک وقت افسانہ نگار، کالم نویس، تجزیہ نگار مبلغہ اور اب ماہر اقبالیات کے روپ میں جلوہ گر ہو رہی ہیں۔ ''فلسفہ غلامی اور اقبالؒ'' پڑھ کر آپ بھی مجھ سے متفق ہو جائیں گے کہ خودی، خودشناسی کا تصور بہت عمدگی سے دیا گیا ہے۔ اس کے بعد حج کے دوران کی کیفیات کے لئے بھی کالم تحریر کیا گیا ہے..... احساسات پر جذبے کی شدت حاوی ہے۔ ''مدینے کی وہ گلیاں جس پاک خوشبو میں رچی بسی ہیں وہاں کی خاک کے ذرے ذرے پر فدائیت کی لازوال داستانیں رقم ہیں۔ بدر وحنین تو محض استعارے ہیں۔''

پیارے قارئین وہ خواتین (حضرات بھی مستفید ہو سکتے ہیں) جو درس وتدریس یا تبلیغ کے پیغمبرانہ مشن سے وابستہ ہیں ان کے لیے کتاب بھرپور مواد فراہم کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ حیا، عید میلاد النبیؐ، رمضان المبارک، عیدالفطر کی خوشیوں جیسے موضوعات پر ایک جامع اور

موثر درس کا مواد موجود ہے (یعنی بنا بنایا لقمہ.....!)

کتاب میں جہاں بھی ماں اور ممتا کا موضوع آتا ہے افشاں نوید کا قلم شاہکار تخلیق کرتا ہے خواہ وہ عافیہ صدیقی کی ماں کی بات ہو یا سترہ سو پردیسی بیٹوں کی منتظر مائیں۔ ممتا کے دکھ کو وہ اس انداز میں شعروں کا پہناوا پہناتی ہیں کہ مزہ دوآتشہ ہو جاتا ہے۔

میری ساری حیات کا حاصل
تحفۂ آسماں پہ قرباں ہے
یہ مری جان کیا کہ سارا جہاں
جنتِ پائے ماں پہ قربان ہے

سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں ''ابلاغی ٹیکنالوجی'' کا جن بوتل سے باہر آ چکا ہے۔ کیا اسے دوبارہ بوتل میں بند کرنا چاہیے یا واپسی کا سفر اختیار کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ میں عورت کا کردار، ویمن کمیشن کا قانون سازی میں کردار، حسینؓ آج بھی زندہ ہے..... قارئین عنوانات سے ہی ظاہر ہے کہ یہ کالم کتنے اہم ہوں گے۔ انتہائی صدمے اور دل شکستگی کی صورت میں ایک مسلمان کس طرح سے رب کی رضا پر راضی رہ سکتا ہے۔ ارفع کریم، خواتین کانفرنس کے بعد آسکر ایوارڈ کے لیے ''ثناء خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں'' میں اپنے اندر کا غم کاغذ کی سطروں میں لے آتی ہیں..... شرمین عبید چنانے کی Saving Face اگر آسکر ایوارڈ لے سکتی ہے تو کیا وہ عافیہ صدیقی پر ہونے والے ظلم کی داستان نہیں فلما سکتیں؟؟ بالخصوص جب عصمت صدیقی (عافیہ کی والدہ) کہتی ہیں ''مجھے آسکر ایوارڈ نہیں چاہیے مجھے تو میری عافیہ چاہیے اب مجھے اس روئے زمین پر کسی سے کوئی امید نہیں بچی..... ہاں امید قائم ہے تو آسمان والے سے'' دل کو بے قرار کر دیتے ہیں۔

افشاں نوید کے دکھوں کی بہت لمبی اور عجیب فہرست ہے۔ نظریہ پاکستان کے کھو جانے کا دکھ، کتابوں کے قیمتی ورثے کو کباڑیوں کے پاس کوڑیوں کے مول بکنے کا دکھ، نائن الیون کے بعد مسلمانوں پر ٹوٹنے والے مظالم کا دکھ.....!

کچھ کالموں کا انتخاب مختصر نثری نظموں سے کیا گیا ہے جو نگینے کی مانند لگتے ہیں۔ کالم ''آخری چھ ماہ'' کے اختتام پر لگنے والی یہ نظم

خواہشوں کے میلے میں
غفلتوں کے مارے ہم
بس یہی سمجھتے ہیں
ہم نے جس کو دفنایا
بس اسی کو مرنا تھا!

کتاب کے اختتام پر ہمارے معاشرتی رویوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو اپنی جگہ قابل غور ہے۔

فوڈ فیسٹیول میں ہمارے کھانے پینے (اور کھاتے ہی رہنے) کے نقصانات کا ذکر ہی نہیں بلکہ تزکیہ نفس سے محرومی ہے رب سے دوری ہے۔

سیدہ ہاجرہ کی کوششوں (سعی) کو ''نقش پا'' کے عنوان سے معنون کرنا اپنی جگہ بہت معنی خیز ہے۔

صدیوں کی گرد جھاڑیئے چشم تصور کو وا کیجئے، ذرا سا پیچھے کی سمت دیکھیئے تو سہی!

نہ آدم، نہ آدم زاد، سبزہ نہ پانی، نہ دور دور تک کسی انسانی قدم کے نشان، ایسا ویران سنسان کہ اپنی سانسوں کی آہٹ محسوس ہو جہاں نومولود ہے اور اس کی ماں..... یہاں بسیرا کرنا ہے؟ آباد کرنا ہے اس جگہ کو؟ یہ کام نومولود اور اس کی ماں انجام دے گی؟ امکانات اور وسائل پر نظر رکھنے والے تو سر جھٹک کر اسے دیوانے کی بڑ قرار دیں گے۔

اور میرے پیارے قارئین انہی الفاظ کے ساتھ قلم کو سوچنے کا موقع دے رہی ہوں کہ آپ تو اسے محض کالموں کا مجموعہ قرار دیں گے دراصل یہ بیک وقت حساس اور دردِ دل رکھنے والی خاتون کے قلم سے نکلنے والے ادبی شہہ پارے ہیں..... جن کو پڑھ کر بے اختیار قلم کی عظمت پر قسم ربی کیوں کھائی گئی، یہ احساس تازہ ہوتا ہے۔

کتاب منگوایئے، مطالعہ کیجئے محض بک شیلف کی زینت مت بنایئے کہ انطقنا اللہ انطق کل شئ' جس روز اللہ ہر چیز کو زبان بخشے گا ان بند رہنے والی کتابوں کو بھی بولنے کا موقع دیا جائیگا۔

اگلے کالم تک اجازت

فی امان اللہ

☆.....☆.....☆

بتول میگزین

دعا

ڈاکٹر گلشن حقیق مرزا

الٰہی پھر دِلوں کو پاک کر ایمان پیدا کر
بڑھے جوشِ اخوّت جس سے وہ سامان پیدا کر
نبیؐ محترم کی پیروی ہی اپنا مسلک ہو
ہمارے ہر عمل میں مومنانہ شان پیدا کر
تیرا کلمہ ہی دل میں ہو، یہی وردِ زبان ٹھہرے
جو تیرے نام پہ مٹ جائیں وہ انسان پیدا کر

وہ احساس کا لمحہ

بشریٰ کنول۔ ہری پور

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم راستے میں رُک کر کوئی منظر دیکھنے لگتے ہیں اور ہمیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس منظر کی کشش نے اپنی جانب متوجہ کر رکھا ہوتا ہے۔ اگر ہماری قوتِ سماعت و بصارت ہمیں الارم نہ دے تو..... کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا جب تیزی سے ختم ہوتی ہوئی قوت بصارت نے مجھے الارم دیا کہ کل جب رب کائنات کے حضور کھڑی ہوگی تو وہ تم سے سوال کرے گا کہ میں نے تمہیں جو صلاحیتیں عطا کی تھیں ان کو کہاں استعمال کیا؟ کرتی کیا رہی؟ وہ توانائیاں کہاں کھوئیں؟ پھر کیا جواب دونگی؟ وہ کاغذ قلم سے محبت جو میرے والدین کے بعد میری تحریک نے عطا کی، محترم اساتذہ نے عطا کی، اسے پس پشت ڈال کر ان تمام محسنین کے احسانات بھلا کر میں کیوں اپنی ذات کی دشمن بن گئی ہوں؟ کیوں رب العالمین کی دی ہوئی صلاحیت کو ضائع کر رہی ہوں؟ اسی سوچ نے دوبارہ قلم کاغذ سے رشتہ جوڑنے پر مجبور کیا۔ اور پھر بہت سی مہربان آوازیں..... آپ لکھ کیوں نہیں رہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے رب کی دی ہوئی نعمتوں کا احساس جب ہی کرتے ہیں جب وہ ہم سے رخصت ہونے لگتی ہیں اور پھر قلم اور علم کی نعمتوں کا مل جانا ایسی بڑی دولت ہے کہ رب کائنات نے اس کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے۔

کر گس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

روبینہ عاطف۔ لاہور

''شکر ہے تم لوگ آ گئیں۔'' پڑوس میں رہنے والی اپنی سہیلیوں عظمیٰ اور فرح کے سلام کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا۔ ''مجھے اس وقت تمہاری مدد کی ضرورت تھی۔''

''کیا ہوا بھئی یہ ہماری مدد کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔'' اس وقت فرح نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''Face Book کھولنا تھا۔'' میں نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیوں کیا ''اکاؤنٹ'' بنانے کا ارادہ ہے۔ ''عظمیٰ نے چڑاتے ہوئے کہا۔

وہ جانتی تھی کہ میں نے ابھی تک اس میدان میں کودنے کی دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔

''نہیں بھئی! معز (اپنے بیٹے) کا Page کھولنا تھا۔''

''خیریت! وہ کیوں؟'' دونوں نے حیرانی سے پوچھا۔

''رات میں نے اس کے پوسٹ کیے ایک میسج پر لمبا چوڑا کمنٹ کیا ہے اس کا جواب دیکھنا تھا۔'' میں نے کہا۔

''تم نے!'' ان کی حیرت برقرار تھی۔ ''وہ کیسے!''

''بھئی موجودہ دور کے والدین کی ذمہ داریوں میں ایک اضافہ

یہ بھی ہے کہ اپنے بچوں کے رابطوں سے باخبر رہیں چنانچہ ان کے والد یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ وہ ہر روز رات کو پڑھتے اور تبصرے کرتے ہیں اور مجھے بھی بتاتے ہیں کل رات کا پیغام ایسا تھا کہ میں تڑپ اٹھی اور تبصرہ کیے بغیر نہ رہ سکی۔''

''اوہو بھئی کیا تھا ہمیں بھی سنادو۔''

''کسی غیر مسلم کی تحریر کردہ چند لائنیں تھیں کہ:

''پہلے میں مرا جا رہا تھا کہ ہائی سکول ختم ہو اور میں یونیورسٹی جا سکوں۔

پھر میں مرا جا رہا تھا کہ یونیورسٹی کی تعلیم مکمل ہو اور میں نوکری شروع کروں۔

میں مرا جا رہا تھا کہ شادی ہو اور بچے ہوں۔ میں مرا جا رہا تھا کہ میرے بچے سکول جائیں۔

میں مرا جا رہا تھا کہ بچے پڑھ لکھ کر زندگی کی دوڑ میں شامل ہوں۔

اب میں مر رہا ہوں تو میں سوچتا ہوں کہ میں تو جیا ہی نہیں۔ زندگی یوں ہی ختم ہو گئی۔''

''آخر میں معز نے لکھا تھا کہ اس شخص نے زندگی کو چند سطروں میں بیان کر دیا ہے۔''

''بھئی اس میں ایسی کیا بات ہے جو تم تڑپ اٹھیں آج کل تو سب کی یہی صورتحال ہے''فرح نے کہا۔

''دراصل مجھے بہت عرصہ پہلے پڑھی ڈاکٹر غلام مرتضیٰ کی بات یاد آئی وہ کہتے ہیں کہ تقابلِ ادیان کی ایک جماعت میں میں نے ایک یہودی، عیسائی اور ہندو لڑکے سے پوچھا کہ آپ تعلیم کیوں حاصل کر رہے ہیں؟ سب نے جواب دیا تا کہ اچھی نوکری، گھر اور گاڑی حاصل کر سکیں۔ میں نے سوچا کہ اگر مسلمان کا جواب بھی یہی ہے تو پھر فرق کیا ہے؟

جانتی ہو یہ فرق بہت اہم ہے۔ ہمیں اس سے آگاہ ہونا چاہیے۔''

میں نے کہا۔''میں نے اپنے بچے کو اس فرق سے آگاہ کیا۔

''بھئی وہ کوئی سکول جاتا بچہ نہیں دوسرے شہر میں نوکری کرنے والا جوان جہان انسان ہے''۔فرح بولی۔

''ویسے بھی تم جانتی ہو نہ آج کل جوانوں کو نصیحت آسانی سے ہضم نہیں ہوتی۔''عظمیٰ نے کہا۔

''اور کیا میں نے تو جب بھی کچھ سمجھانے کی کوشش کی آگے سے نئی تاویلیں نئے فلسفے سننے کو ہی ملے۔ اور تو اور بعض اوقات تو بچے کہتے ہیں امی جان میں کسی مولانا کی روح حلول کر گئی ہے ہر بات پر لیکچر شروع ہو جاتا ہے میں تو کہتی ہوں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے بالغ ہیں خود ہی اپنے اعمال کا حساب بھگتیں گے۔''فرح نے دلیل دی۔

نہیں بھئی! ایسا نہیں کر سکتے جانتی ہو سبت کا قانون توڑا گیا تو تین گروہ بن گئے تھے۔ ایک نافرمانی کرنے والوں کا ایک انہیں منع کرنے والوں کا اور ایک انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینے والوں کا اور اللہ کے عذاب سے صرف منع کرنے والے ہی بچے تھے۔ اور پھر اپنی اولاد سے تو والدین کبھی بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔''

''اچھا یہ تو بتاؤ تم نے تبصرہ کیا لکھا تھا؟''عظمیٰ نے پوچھا۔

''سب سے پہلے تو شعر تھا۔

موت کو سمجھے ہے غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

ایک مسلمان کہتا ہے کہ

''میں جیا کہ علم حاصل کر کے اللہ کو پہچان سکوں۔ میں نے نوکری حاصل کی تا کہ کما کر اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کروں۔

میں نے شادی نبی کریمؐ کی سنت کی پیروی میں کی۔ میں نے اپنے بچوں کی تربیت کی تا کہ وہ میرے لئے صدقہ جاریہ بن سکیں۔

اب جبکہ میں مر رہا ہوں تو مجھے اپنے رب کی رحمت سے اُمید ہے کہ میں اس کی ہمیشہ رہنے والی جنت میں جگہ پاؤں گا۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

سوچ کا فرق واضح کرنے کیلئے میں نے آخر میں علامہ اقبالؒ کا یہ شعر شامل کیا۔

پرواز ہے دونوں کی ایک اسی فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

''بس تم اب نہیں بچتیں۔'' فرح نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ ''صاحبزادے نے کہنا ہے گھر میں تو لیکچر چلتے تھے اب فیس بک پر بھی شروع ہوگئیں میرے دوست کیا کہیں گے وغیرہ وغیرہ۔''

''مجھے بھی کسی ایسے ہی جواب کا خوف تھا۔ لیکن دل رب کی شکر گزاری کے کلمات اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں جب لیپ ٹاپ پر Abdul Moiz liked this comment کے الفاظ پڑھے۔''

ام حکیم کی وصیتیں

شہزادی ام صائم

لوگوں کے عیوب افشا مت کرو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے گھر کے اندر تمہاری برائیاں ظاہر کر دے گا۔ پس اللہ تعالیٰ بہت زیادہ پردہ پوشی کرنے والا ہے۔ جو پردہ پوش کو پسند کرتا ہے۔ اور وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ جب تمہاری طاقت تمہیں لوگوں پر ظلم کرنے کی دعوت دے تو یاد رکھو کہ اللہ زیادہ قدرت والا ہے۔

سبق: نبیؐ نے فرمایا: ''مومن مومن کا آئینہ ہوتا ہے۔'' اس فرمان کو گہرائی سے سوچیں کیا آئینہ ہمارے عیب کسی دوسرے کو بتاتا ہے، ''نہیں'' بلکہ خود ہمیں ہی بتاتا ہے۔ آئینہ میں اگر اپنی شکل بری لگے تو کیا آئینہ توڑ دیتے ہیں لیکن اگر کوئی مومن دوسرے کو اُن کی برائی بتا دے تو وہ برائی بتانے والے کو جو بدنام کرتا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ یاد رکھیں، دوسروں کی عزت اچھال کر خود عزت سے نہیں رہیں گے، کسی کو دیکھنے کے بھی دو رویے ہیں، (۱) اصلاح کے لئے (۲) بگاڑ۔ رسوا کرنے کیلئے (تو دیکھیں میرا رویہ کیا ہے) خود کو مثبت لوگوں کے ساتھ مثبت کاموں میں مصروف رکھیں۔ اکثر لوگ بیکار ہوتے ہیں اور بیکار سوچوں میں رہتے ہیں، جلتے کڑھتے رہتے ہیں تو یہ فراغت کی سزا ہے خالی ذہن شیطان کا ہوتا ہے۔

☆ جب تم کسی دن دل کی سختی محسوس کرو، تو یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرو اور عنقریب تم حیران ہو جاؤ گے کہ کیسے ہاتھ پھیرنے سے دل کی سختی نرمی میں بدل جاتی ہے اور چھٹ جاتی ہے۔

سبق: یہ نبیؐ کی تعلیم ہے اور دل کی سختی کا علاج بھی ہے۔ فزیکلی کام کرنے اور صرف باتیں کرتے رہنے میں بہت فرق ہے۔ ہر انسان اپنے بارے میں ضرور سوچے۔

☆ بحث و مباحثہ مت کرو۔ کیونکہ بحث و مباحثہ میں دونوں اطراف کا نقصان ہے۔ اگر بحث میں ہم نے شکست کھائی تو ہم نے اپنی بڑائی خود نقصان میں ڈال دی اور اگر ہم کامیاب ہو گئے۔ (یعنی بحث میں جیت گئے) تو ہم نے دوسرے شخص کو خسارے میں ڈال دیا جبکہ درحقیقت ہم سب نے شکست کھائی۔ جس نے بدلہ لے لیا اس نے بھی اور اُس نے بھی جس نے سمجھا کہ اس کی مدد نہیں کی گئی۔

سبق: یعنی کبھی ہم ہار کر بھی بہت کچھ جیت جاتے ہیں اور کبھی جیت کر بھی سب کچھ ہار جاتے ہیں سارے جھگڑے شروع ہی بحث و مباحثہ سے ہوتے ہیں تو وقتی طور پر جھگڑے سے اعراض کرنا چاہیے اور بعد میں اس کا حل نکالنا چاہیے۔ بہت سی چیزیں ہم دوسروں کو نرم رویہ سے ہی سکھا سکتے ہیں۔ بات اس طرح کی جائے کہ دوسرے کا ضمیر جاگے نہ کہ انا۔ اور ایسی جیت کا کیا فائدہ جس سے ہم دوست کھو دیں۔

☆ اے میرے بیٹے! تم یہ کر سکتے ہو کہ لوگوں کے خیالات کو تبدیل کر دو، اور تم لوگوں کے دلوں پر قبضہ کر سکتے ہو۔ جبکہ ان کو پتہ بھی نہ چلے، سحر، شعبدہ بازی سے نہیں بلکہ اپنی مسکراہٹ سے اور میٹھے الفاظ کے ساتھ تم مسحور کر سکتے ہو۔ مسکراتے رہو، پس پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے دین میں مسکراہٹ کو بھی عبادت بنایا ہے اور اس پر ہمیں اجر بھی ملے گا۔

سبق: چائنہ میں قانون ہے اگر آپ کے مزاج میں مسکراہٹ نہیں ہے تو وہ آپ کو دکان کھولنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اگر آپ کے سامنے کوئی مسکرانے والا نہیں ہے تو پھر تم خود اس کے لیے مسکراؤ، جب تمہارے دانت بہت جلد مسکراتے ہیں تو تمہارے لئے دل بہت جلد کھل جائیں گے تاکہ وہ اظہار کریں۔

سبق: اس سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ مومن دینے والا ہوتا ہے۔ اکثر اوقات دوسرے لوگ جھجک رہے ہوتے ہیں کہ بات کریں یا نہ کریں لیکن جب ہم مسکرا کر دیکھ لیتے ہیں تو سامنے والے کو بات کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اپنا لہجہ، اپنا رویہ، اپنی باتیں، ایسی اختیار کرو کہ سامنے والے کو پتہ بھی نہ چلے اور آپ اس کے دل میں اُتر چکے ہوں۔ دل جیتنا جادو یا شعبدہ بازی کا کام نہیں بلکہ اخلاق سے دل میں گھر کیا جاتا ہے۔ رسولؐ نے فرمایا: اپنے بھائی کو مسکرا کر دیکھنا بھی تیرے لئے صدقہ ہے۔'' پھر وصیت میں کاروبار کے لئے مسکراہٹ شرط۔ تو ہم بھی تو دین پہنچانے والے ہیں۔ ہم بھی تو دوسرے لوگوں سے ایک معاہدہ کر رہے ہوتے ہیں۔ یعنی اللہ کی پہچان کروانے کا اور چہرے پر خواہ مخواہ سنجیدگی کا خول چڑھایا ہوتا ہے۔ جب کہ سیدنا عبداللہ بن الحارث بن جزء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ ''میں نے رسولؐ اللہ سے زیادہ کسی کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا'' وہ کیا چیز ہے جو انسان کو ہر حال میں مسکرانا سکھا دیتی ہے۔؟ وہ یہ ہے جب اللہ کی نعمتوں پر غور کریں۔ شکر یہ ادا کریں اور سب سے زیادہ شکر قرآن کے علم کا تو خود بخود ہی مسکراہٹ آئے گی۔ اور پھر سب سے پہلے خاندان میں خاوند، بیوی، اولاد، بہن بھائی، سب اقرباء کے ساتھ مسکرا کر ملنا۔ بہت سی بدگمانیاں دور کر دیتا ہے۔

☆ اے میرے بیٹے! لوگوں اور چیزوں کے متعلق اس وقت تک بات کرنے سے بچو جب تک ان کے ماخذ کے صحیح ہونے کا یقین نہ ہو۔ جب کوئی تمہارے سامنے کوئی خبر لائے تو جلدی کرنے سے پہلے اس کی تحقیق کرو۔ اور مشہور خبر پر یقین کرنے سے بچو۔

جب اللہ تمہیں دشمن کے ساتھ مبتلا کریں تو اس کا مقابلہ اس پر احسان کرتے ہوئے کرو، ایسے طریقے سے ہٹاؤ جو سب سے اچھا ہو۔ میں اللہ کی قسم کھاتی ہوں بے شک دشمنی محبت میں بدل جائے گی۔ سوچو ذرا!

سبق: بس ایک بات سوچ لیں۔ برائی کا جواب برائی نہیں ہوتا نہ ہی گندگی کے جواب میں گندگی پھیلائی جاتی ہے برائی کا جواب اچھائی سے دیں اگر برائی کرنا اس کا عمل ہے تو اچھائی کرنا ہمارا عمل ہونا چاہیے۔

آخر میں سب سے اہم بات اہم اصول۔

☆ جب تم میرے بطن میں تھے تو میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں تمہاری تربیت کروں گی تا کہ تم عظیم شخصیت بن جاؤ اور اگر تم کہو کہ اے میری امی جان! کیوں آپ نے بہت جلدی تربیت شروع کی۔ (یعنی میں چھوٹا ہوں) (تو میں کہوں گی کہ بیٹا) تمہیں عنقریب پتہ چلے گا کہ انسان جب بڑا ہو جاتا ہے تو پھر اسے کوئی چیز فائدہ نہیں پہنچاتی سوائے کسی معجزے کے، جب تک وہ اپنے آپ کو تبدیل نہ کرے۔

سبق: بس ہماری اصلاح ہماری اپنی کوشش سے ہو سکتی ہے۔ انسان اپنے اصل اور حقیقت کو دیکھے کہ کہاں سے اس کی تخلیق کا آغاز ہوا اور جب اللہ نے اسے درجہ بدرجہ صلاحیتیں عطا فرمائیں تو اس نے اپنی قابلیتیں کہاں لگائیں۔

کیونکہ ہمارے موضوعات، دوسرے لوگ، دوسرے ملک، دوسری ریاستیں اور ہم خود کو بھولے ہوئے ہیں۔

ہم اپنی ذات کو بھولے ہوئے ہیں سب سے پہلے خود پر بات کریں اور خود پر کام کریں۔ یعنی اپنی اصلاح کریں۔

آخر کیوں نہیں؟

نسرین لئیق۔ کراچی

جماعت اسلامی کے اجتماع عام کے دوران ہم نے انٹرنیشنل کانفرنس میں شرکت کی جس میں تمام دنیا کے اسلامی تحریکوں کے مندوبین نے مختصر خطاب کیا۔ سری لنکا میں تعلیم کی شرح اور پڑھے لکھے لوگوں کے آبادی میں اونچے تناسب کا سُن کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ لوگ جھونپڑی اسکول بنا کر تعلیم عام کر رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں اسکولوں کی بڑی بڑی عمارتیں اوطاق یا بھینس باندھنے یا نہاری ہاؤس کھولنے کے کام آرہی ہیں۔ ہمیں جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور بڑے بڑے کاروباری سیاست دانوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کیلئے نیک مقاصد رکھنے والی جماعتوں اور پاکستان سے محبت کرنے والوں کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنی ہوگی جب ہی سرزمین پاک سے بدی کے نظام کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ مصر میں انقلاب آیا انہوں نے سازش کر کے اسے ناکام بنا دیا وہ برائی کے

لیے اکٹھے ہیں تو ہم اچھائی کے لیے کیوں متحد نہیں ہوتے؟

برائٹ فیوچر

ابو فائق۔کراچی

پچھلے وقتوں میں پانچ چھ سال کی عمر کے بچے کو سکول بھیجا جاتا تھا۔آج کل کے مونٹی سری سسٹم میں نہایت کم عمر بچوں کو اسکول داخل کرا دیا جاتا ہے اور وہ ماں باپ سے الگ ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔مہنگے سکولوں میں ہزاروں روپے فیس دے کر بچے کا داخلہ کروایا جاتا ہے۔ اس کے بعد معصوم بچے پر کیا گزرتی ہے آیئے دیکھیں:

پہلے دن والدین کو اسکول انتظامیہ کی بریفنگ کے بعد بچوں کے ساتھ کلاس روم جانے کی اجازت تھی۔کلاس روم میں رنگا رنگ تصاویر اور کھلونے دیکھ کر بچے اور والدین بہت خوش تھے اور انتظامیہ/ٹیچرز کی خوشی کی تو انتہا ہی نہیں تھی۔کیونکہ انہیں ہزاروں روپے کی فیس دینے والے بچوں کا ایک نیا batch مل گیا تھا۔

دوسرے دن جب بچے کو اسکول چھوڑنے گئے تو معلوم ہوا کہ والدین کو کلاس میں جانے کی اجازت نہیں لہٰذا اپنے بچے کو (جو کبھی اپنے والدین، دادا، دادی، پھوپھیوں سے پل بھر کیلئے جدا نہ ہوتا تھا) روائتی قسم کی آیا جی کے رحم و کرم پر روتا اور تڑپتا چھوڑ گئے۔بچے نے تین گھنٹے جیسے تیسے گزارے، چھٹی کے وقت آنسوؤں کی ایک لڑی تھی جو رکنے کو نہ آتی تھی اور چہرہ خوف زدہ تھا۔بچے کی پژمردہ حالت بتا رہی تھی کہ کچھ اچھا نہیں ہوا ہے۔

تیسرے دن بھی انتظامیہ کی طرف سے کچھ ایسے ہی احکامات تھے لیکن ماں جرأت کرتے ہوئے اپنے سہمے ہوئے دل کے ٹکڑے کو کلائی سے پکڑ کر کلاس تک لے گئی۔بچہ بلک بلک کر اپنی ماں سے التجا کر رہا تھا کہ ماما مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ آخر میرا قصور کیا ہے میں تمہارا ہر کہنا مانوں گا، میرے پاس ہی بیٹھی رہو کیونکہ مجھے اس کلاس روم سے خوف آتا ہے۔لیکن ماں کے سامنے اچانک برائٹ فیوچر کا خیال آیا اور وہ اپنے لختِ جگر کے ہاتھ کو ایک جھٹکے سے چھڑا کر جلدی سے باہر نکل گئی اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کہیں دل نہ پسیج جائے۔بچے کے رونے، آہوں اور سسکیوں کی آواز دیر تک سنائی دیتی رہی اور بالآخر آنسو خشک ہونے کے ساتھ ساتھ سسکیاں بھی مدہم پڑ گئیں اور بچہ نڈھال ہو کر خاموش ہو گیا۔یہ خاموشی اسکول ٹیچر کی نظر میں کامیابی کی طرف پہلا قدم تھا۔کیونکہ ان کے کہنے کے مطابق شروع شروع میں ایسا ہوتا ہے بعد میں بچے سیٹ ہو جاتے ہیں۔واپسی پر بچہ بخار میں تپ رہا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔بچہ اپنی ماں کی آغوش میں آیا تو سینے سے چمٹتے ہی سو گیا کیونکہ اس تین گھنٹے کی Tension کے بعد اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔یہ چند گھنٹے بچے پر کیسے گزرے ہونگے کاش بچے میں اتنی سکت ہوتی کہ وہ بتا سکتا۔

تین دن کی دوا دارو کے بعد بچہ جب صدمے سے باہر نکلا تو صرف اتنا بتا سکا کہ کس طرح آیا جی نے یہ کہہ کر دروازہ لاک کر دیا تھا کہ تمہاری ماما چھوڑ کر چلی گئی ہے، خاموش ہو جاؤ اور ٹیچر نے تو حد ہی کر دی کہ اگر تم روئے تو جیل بھیج دیں گے۔

چوتھے دن ابو دادا نے بے رحم ماں سے بچہ لے کر خود کمان سنبھال لی اور سینہ تان کر بچے کو بہلاتے پھسلاتے اسکول لے گئے۔اسکول پہنچتے ہی بچے کی حالت خوف سے پھر غیر ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ابو دادا جن کے اوپر پہلے ہی الزام تھا کہ لاڈ میں بچے کو برباد کر رہے ہیں دل کو سخت کر کے اسکول گیٹ میں داخل ہو گئے لیکن خوف اور دہشت کی وجہ سے بچے کو باتھ روم کی ضرورت پیش آ گئی چنانچہ بچہ پھر ایک دفعہ مجبوراً ظالم آیا جی کے حوالے تھا۔بچہ تڑپ تڑپ کر فریاد کر رہا تھا کہ دادا ابو خدا کے لیے مجھے اس کے حوالے نہ کریں یہ مجھے مارے گی۔ابو دادا آپ باتھ روم میرے ساتھ چلیں لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ابو دادا باتھ روم کے دروازے پر کھڑے ہو گئے اور آیا جی نے حسب معمول اپنے سخت اور بے رحم ہاتھوں سے جھٹک کر بچے کو کموڈ پر بٹھا دیا۔ابو دادا کی برداشت اس وقت جواب دے گئی جب بچہ اپنے ننگے جسم کی پروا کیے بغیر بار بار باتھ روم سے باہر نکل کر آتا اور اپنے ابو دادا کی ٹانگوں سے چمٹ جاتا۔برائٹ فیوچر کی متمنی ماں ہوتی تو شاید بچے کو یہ دن بھی اسکول گزارنا پڑتا لیکن دادا کے حکم پر بچے کا اسکول چھڑوا دیا گیا۔ہمارے ہاں مونٹی سری سسٹم جس شکل میں رائج ہے، کیا وہ بچوں کی نفسیاتی ضروریات کے مطابق ہے؟ محکمہ تعلیم کو اس سوال پر ضرور غور کرنا چاہیے۔

☆.....☆.....☆

اینٹی بایوٹک ادویات

بچوں کی دشمن بھی ہوسکتی ہیں

ابوداؤد، نسائی، اور ابن ماجہ نے عمرو بن شعیب سے حدیث روایت کی ہے۔

قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من تطبب ولم یعلم منہ الطب قبل ذلک فھو ضامن.

انھوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے علاج کیا اور اس سے پہلے اس کو علاج کا علم نہ تھا۔ وہ ذمہ دار ہے۔ (کسی بھی نقصان کا)۔

بچوں سے محبت کا ایک روپ یہ بھی ہے کہ اگر وہ بیمار پڑ جائیں تو والدین ان کی جلد سے جلد صحت یابی کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں۔ والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ڈاکٹر ان کے بچے کے لیے ایسی دوا تجویز کرے جس کی پہلی خوراک سے بچہ ٹھیک ہو جائے۔ جب بچہ جلدی سے ٹھیک ہو جاتا ہے تو وہ سوچتے ہیں کہ یہ قابل ڈاکٹر ہے۔ وہ ہر بار علاج کے لیے اس کے پاس جاتے ہیں۔

یہ صورت ان امراض میں بچوں کے لیے نقصان دہ بن سکتی ہے جن میں علاج کے لیے اینٹی بایوٹک ادویات استعمال کی جاتی ہیں۔ یا ڈاکٹر کے مطابق علاج کے لیے ان کے سوا کچھ اور مناسب نہیں ہوتا۔ یہ صورت خاص طور پر بچوں کے لیے اس وقت اور خطرناک بن جاتی ہے جب ڈاکٹر کسی بھی وجہ سے دوا کی مدت یا مقدار کا دھیان نہ رکھے۔ طبی ماہرین کے مطابق اینٹی بایوٹک ادویات کا استعمال احتیاط اور ضرورت کے مطابق ہی کرنا چاہیے۔ دوسری صورت میں بجائے فائدہ کے نقصان بھی ہوتا ہے۔

یہ نقصان دی جانے والی دوا کے غیر موثر ہونے کی صورت سامنے آتا ہے۔ جسے دوا کے خلاف مزاحمت کہا جاتا ہے۔

عام طور پر معالج یا تو اس کا دھیان نہیں رکھتے یا پھر اسے ایک حربے کے بطور استعمال کرتے ہیں۔ اُنھیں مریض کو پہنچنے والے نقصان کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی۔ ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں مریض کے علاج کا کوئی ریکارڈ نہیں پایا جاتا۔

یہ ایک المیہ ہے۔ کسی بھی مریض کا باقاعدہ علاج ہونا چاہیے اور اس کا ریکارڈ موجود ہونا چاہیے کہ کس کس قسم کی اس کو ادویات ملیں اور یہ ریکارڈ ایک مرکزی نظام کے تحت رکھا جانا چاہیے یا کم از کم ہر مریض کو اس کی فائل دی جانی چاہیے تاکہ آئندہ علاج میں سابق معلومات کو بھی مدنظر رکھا جائے۔

علاج صرف یہ نہیں کہ دوا تجویز کر دی جائے۔ معالج کو اس بات سے آگاہ ہونا چاہیے کہ مریض ماضی میں کس مرض میں کون سی ادویات استعمال کر چکا ہے اور اس کے علاج کے لیے کیا کیا تدابیر استعمال کی جا چکی ہیں خصوصاً بچوں کا معاملہ نہایت حساس ہوتا ہے ان کے فطری نظام میں آنے والی غیر فطری تبدیلیاں ان کی آئندہ زندگی پر اثر انداز ہوسکتی ہیں۔

اینٹی بایوٹک ادویات اس اعتبار سے سرفہرست ہیں کہ یہ بچوں کے لیے خصوصاً اور بڑوں کے لیے عموماً نقصان دہ اثرات رکھتی ہیں۔

اینٹی بایوٹک ادویات اب بھی بیکٹیریا کے باعث ہونے والی بیماریوں کے خلاف انتہائی موثر ہیں۔ یہ نہ صرف زندگی بچاتی ہیں بلکہ بیماریوں سے تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب یہ زائد مقدار میں استعمال کی جائیں یا ان کا استعمال غلط ہو تو یہ متعلقہ فرد کو کسی بڑے خطرے کا ہدف بنا دیتا ہے۔ جوں جوں اینٹی بایوٹک ادویات کا استعمال بڑھ رہا ہے (خاص کر غلط استعمال) ان کے خلاف انسانی جسم کی مزاحمت بھی بڑھ رہی ہے۔ وقت کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

کوالالمپور کے ملایا میڈیکل سنٹر کی فیکلٹی آف میڈیسن کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر یاسمین ابوحنیفہ کہتی ہیں:

بچے عموماً بار بار بیمار پڑتے ہیں۔ کیوں؟ اس بارے میں والدین بہتر تجزیہ کر سکتے ہیں۔ بچوں کو بڑوں سے زیادہ اینٹی بایوٹک ادویات دی جاتی ہیں۔ عام طور پر لائے گئے بچے بخار میں مبتلا ہوتے ہیں اس بخار کا بیشتر سبب وائرل انفیکشن ہوتا ہے تو اس صورت میں اینٹی بایوٹک ادویات کی ضرورت نہیں ہوتی اور معمولی انفیکشن میں بھی ان کی ضرورت نہیں ہوتی۔

بیکٹیریا ادویات کے خلاف مزاحمت حاصل کر لیتے ہیں۔ مختلف بیکٹیریا ایک سے زیادہ ادویات کے خلاف مزاحمت رکھتے ہیں کچھ ڈاکٹر بیکٹیریائی انفیکشن کی تشخیص نہ ہونے کے باوجود ایسا کرتے ہیں جو پیشہ ورانہ دیانت کے خلاف ہے۔

کچھ والدین ڈاکٹر سے رابطہ کیے بغیر خود ہی میڈیکل سٹور سے اینٹی بایوٹک خرید کر بچوں کو دینا شروع کر دیتے ہیں ایک رپورٹ کے مطابق اینٹی بایوٹک ادویات کے خلاف مزاحمت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ ہمیں مزید نئی اینٹی بایوٹک ادویات کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے ادویات ساز ادارے کام کر رہے ہیں۔ لیکن نئی ادویات مارکیٹ میں آنے سے پہلے مختلف مراحل سے گزرتی ہیں تب انھیں مارکیٹ کرنے کی اجازت ملتی ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ جن اینٹی بایوٹک ادویات کے خلاف مزاحمت سامنے آ چکی ہے۔ ان ادویات کا متبادل بھی ضروری ہے۔

بچوں میں اینٹی بایوٹک کے منفی پہلو سامنے آنے کے بعد والدین کا فرض ہے کہ احتیاط کریں۔

بچے کو ہمیشہ کسی مستند ڈاکٹر کو دکھائیں۔ ہر صورت حال میں دوا کے لیے اصرار نہ کریں۔ اینٹی بایوٹک ادویات صرف بیکٹیریائی انفیکشن کے لیے ہی مفید ہوتی ہیں۔ وائرل بیماریوں میں یہ کوئی کردار نہیں رکھتیں۔ اس لیے اچھی طرح تصدیق کے بعد دینی چاہئیں۔

بچوں کی صحت صرف والدین کا مسئلہ نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی یہ قوم کا معاملہ ہے۔ صحت مند بچے صحت مند معاشرہ پروان چڑھاتے ہیں۔

☆☆☆